CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

پمپوش

(افسانوی مجموعہ)

دیپک کنول

15-10-2011

راہی کتاب گھر
C-20، جیوتی کالونی، گلی نمبر 5، لونی روڈ، شاہدرہ، دہلی۔110032

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

© جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

Pamposh
by: Deepak Kanwal
Price : Rs. 200/-
Edition : 2011

RAHI KITAB GHAR
C-20, Jyoti Colony, Loni Road,
Street No. 5, Shahdara, DELHI-110032
Ph. : 011-22832249, Mob.: 9818786196

Sole Distributors:-
KITAB WALA
2794, Street Jhot Wali,
Pahari Bhojla, DELHI-110006
Ph.: (O) 011-23281499, 011-23240379
(M) 9810277298

ISBN : 81-88645-50-8

نام کتاب : پمپوش
مصنف : دیپک کنول
سن اشاعت : ۲۰۱۱ء
قیمت : =/۲۰۰ روپے
مطبوعہ : فائن آفسیٹ پریس، شاہدرہ، دہلی۔32
ناشر : راہی کتاب گھر، C-20، جیوتی کالونی، گلی نمبر 5،
لونی روڈ، شاہدرہ، دہلی۔110032
ملنے کا پتہ : جواہر پبلکیشنز، 16/4 رینائسنس پلاٹ نمبر۔9 سیکٹر۔8 مہاڑا،
مالونی۔ملاڈ (ویسٹ) ممبئی۔400095 فون نمبر:۔022-28804213

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

انتساب

اپنی اُس بیمار اور لاچار

ماں کے نام

جو پچھلی دو دہائیوں سے سب کچھ بھول چکی ہے۔
بس وہ اُس گھر کو بھول نہیں پائی ہے جسے
نفرت اور دہشت کے سوداگروں نے
آگ کی نذر کر دیا۔

دیپک کنول
ممبئی

اس مجموعے کے سبھی کردار اور واقعات فرضی ہیں۔ کسی قسم کی مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی
جس کے لئے مصنف یا ناشر ذمہ دار نہیں ہوگا۔)

— ناشر

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ترتیب

- کچھ کتاب کے بارے میں..... 7
- کہتے ہیں اہل زبان 11
- لالی کی مکھنی 23
- قصائی کی بکری 32
- بازی گر 41
- رشتے 54
- پوسٹ مارٹم 63
- نانی خیر والی 72
- بانگی مرغا 83
- مچھی والا 93
- آوارہ کتا 102
- سنتا کی گوری 111
- باباجی 121
- فاصلے 133
- مرغی چور 142
- پمپوش 152

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کچھ کتاب کے بارے میں.....

دیپک کنول ہندوستان کے اُن معتبر کہانی کاروں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے کہانی پن کو نہ صرف زندہ رکھا ہے بلکہ اُردو ادب کو کئی شاہکار کہانیاں دی ہیں۔ ''سنتا کی گوری'' جیسی بہترین کہانی لکھنے والے دیپک کنول کا تعلق کشمیر سے ہے۔ یوں تو کشمیر کے کئی کہانی کاروں نے کشمیر کے نام کو زندہ رکھا ہے۔ نور شاہ، دیپک بدکی، آنند لہر، ترنم ریاض، ابن اسماعیل بہت اچھی کہانیاں لکھ رہے ہیں اور لکھی ہیں لیکن جس انداز سے دیپک کنول کہانی کا اختتام کرتے ہیں وہ اُن کا نہ صرف منفرد انداز ہے بلکہ اُن کی کہانی دیر تک ہی نہیں برسوں ذہن پر چھائی رہتی ہے۔ بعض کہانیوں میں تو وہ قاری کو رلا دیتے ہیں۔ وہ تحریر ہی کیا جو قاری کے ذہن کو ہلا نہ دے، اُس پر اثر نہ ہو۔ دیپک کنول کی کہانیوں کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ پڑھنے کے بعد اُن کی کہانی کے اثرات بڑے گہرے ہوتے ہیں۔ وہ کہانی میں کوئی فلسفیانہ گفتگو کر کے کہانی کو قاری پر زبردستی نہیں تھوپتے بلکہ بہت عام کرداروں میں ایک عام انسان کی زندگی کو وہ جیسی دیکھتے ہیں، ویسی ہی پیش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اُن کا تعلق کشمیر سے ہے جسے کبھی ہندوستان کی جنت کہا جاتا تھا۔ جہاں چاروں طرف خوشحالی تھی۔ ہر طرف پھول کھل رہے تھے۔ سیلانیوں کا ہجوم رہتا تھا۔ لوگ ایک دوسرے پر جان دیتے تھے۔ اس کشمیر کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی کہ جہاں بہاریں ہی بہاریں تھیں اب وہاں آگ کے شعلے نکل رہے ہیں۔ کلیاں مرجھا گئی ہیں۔

بہار خزاں میں بدل گئی ہے۔ زمین وہی، پیڑ پودے وہی، وہی جھیلیں، تالاب اور جھرنے لیکن ایک خوف ہر دل پر چھایا ہوا ہے۔ بھائی بھائی کا دشمن ہو گیا۔ کسی کی زندگی محفوظ نہیں رہی۔ سینکڑوں لوگ ہجرت کر کے اپنے پیارے وطن کو خیر باد کہہ کے روزگار کی تلاش میں نکل گئے ہیں۔ اپنے جنت نما وطن کو چھوڑنے میں کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ اُس پر کیا گزرتی ہے یہ سب کچھ دیپک کنول نے اپنی آنکھوں سے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

دیکھا ہے۔وہ بیس برس پہلے انہی حالات میں اپنا وطن چھوڑ کر ممبئی آ گئے اور مشہور فلمی اداکار شہنشاہ جذبات دلیپ کمار کے یہاں رہے جہاں اُنہوں نے دلیپ کمار کو قریب سے دیکھا اور برسوں اُن کے پاس رہ کر جیسا اُنہوں نے دلیپ کمار کی شخصیت کو پایا وہ سارے حالات اور دلیپ کمار کی زندگی سے متعلق کئی مختلف پہلوں پر اُنکی منفرد شخصیت پر ایک بہترین کتاب لکھ ڈالی جسے پرائم ٹائم پبلکیشنز لاہور نے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔اُنکی زندگی میں دھیرے دھیرے خوشحالی تو آئی لیکن کشمیر کی یادیں اپنا گھر اور ہجرت کے اُس کرب کو وہ بھول نہیں پائے۔کشمیر اُنکے ذہن سے ایک پل بھی نہ گیا۔کشمیر کی یادوں نے اُنہیں اتنا بے چین کر دیا کہ اُن کی ہر کہانی میں وہ اپنی پوری تخلیقی توانائی کیساتھ اُن کی کہانیوں میں موجود ہے۔کبھی ''سنتا کی گوری'' میں کبھی ''مرغی چور'' میں تو کبھی ''پمپوش'' میں تو کبھی ''مچھی والی'' میں۔''سنتا کی گوری'' میں گائے کو علامت بنا کر اُنہوں نے پیار و محبت اور بھائی چارے کی ایسی مثال قائم کی کہ یہ کہانی ایک بہترین کہانی بن گئی۔اس مجموعے میں شامل ہر کہانی بے مثال ہے۔کہانی ''پمپوش'' کو ہی لیجئے نا جس میں ایک کردار فردوسہ ہے جو پھول بیچ کر اپنا گزارہ کرتی ہے۔ایک تو پھول خود خوشحالی اور پیار و محبت کی نشانی ہوتا ہے اور خاص طور پر کشمیر تو مرکز ہے پھولوں کا۔ظاہر ہے کہ اب وہ کشمیر اور اُس کے پھول کس طرح مرجھا گئے ہیں یہ کسی سے چھپا نہیں ہے۔فردوسہ جو کہ پھولوں کا بیوپار کرتی ہے۔اس کے پھول (پمپوش) سب سے زیادہ مندروں کے پجاری خریدتے ہیں۔انہی پجاریوں میں ایک مادھو جوتھا جس کی صورت اُس کے دادا سے ملتی تھی۔وہ بھی اسے اپنی بیٹی کی طرح سمجھتا تھا اور ہر روز اُس کے پھول خریدتا تھا۔پھر فردوسہ کی زندگی میں ایک انقلاب آ گیا۔اُسکی شادی ہو گئی لیکن شوہر ناکارہ نکلا۔شراب پینا اور ظلم ڈھانا روز کا معمول ہو گیا اور ایک روز وہ اُسے تنہا چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔کئی دن اُس نے بڑی کسم پرسی میں گزارے یہاں تک کہ بچوں کو بھوکوں مرنے کی نوبت آ گئی۔کوئی دو سال کے بعد پھر اُس نے پھولوں کا ٹوکرا اُٹھایا لیکن اب کشمیر کے حالات بدل چکے تھے۔ہزاروں پنڈت ہجرت کر کے جا چکے تھے۔پھول خریدنے والے دور دور تک نظر نہیں آ رہے تھے۔ایک دن اُس نے مادھو جو سے ملنے کا فیصلہ کیا۔اس سے پہلے کہ اس کہانی پر آگے گفتگو کی جائے یہاں کہانی کا ایک اقتباس پیش ہے۔

''آج وہ اُس سے ملنے جا رہی تھی جس میں اُسے اپنے دادا کی شبیہ نظر آتی تھی۔وہ سوچنے لگی کہ وہ کس طرح مادھو جو کا سامنا کر پائے گی۔کیا وہ اُسے اس بات کے لئے ڈانٹے گا نہیں کہ اس آڑے وقت

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

میں اُس نے ایک بار بھی اُس کی سدھ نہ لی۔ وہ ان ہی سوالوں میں اُلجھی ہوئی جب گنپت یار مندر کے اندر پہونچ گئی تو یہ دیکھ کر اُس کا دل بلیوں اُچھل پڑا کہ مندر میں شو کی مورتی کی جگہ خود مادھو جو براجمان تھا۔ وہ اپنی خوشی کے آنسو روک نہ سکی اور بے قابو ہو کر اُس نے اپنی تھیلی میں رکھے سارے پمپوش نکال کر اُسکی طرف اُچھال دئے۔ پھر وہ ریلنگ کے ساتھ لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ رونے کی آواز سن کر باہر پہرہ دے رہے سی۔ آر۔ پی کے کچھ جوان بندوقیں تان کر اندر آ گئے۔ ایک عورت کو مندر کے اندر دیکھ کر وہ سناٹے میں رہ گئے۔ اُنہوں نے ہڑ بڑاہٹ میں اُسے پکڑ لیا اور اُسے گھسیٹتے ہوئے باہر لے جانے لگے۔

وہ مسلسل روتی چلاتی رہی۔ شور سن کر مندر کا نیا پجاری اپنے کمرے سے باہر آ گیا۔ اُس نے جب ایک مسلم خاتون کی درد شا دیکھی تو اُس نے اُسے نوجوانوں سے چھڑا لیا اور اُسے ایک کونے میں بٹھا کر پوچھا۔ ''تم اس مندر میں کیسے آ گئی ہو بہن؟'' ''وہ وہ جو مادھو جو اندر بیٹھا ہے میں اُسی سے ملنے آئی ہوں۔'' ''مادھو جو اندر بیٹھا ہے'' اُس نے چونک کر پہلے اُسکی طرف دیکھا اور پھر اُسکے سراپا کا طائرانہ جائزہ لے کر وہ بڑی رقت بھری آواز میں بولا۔ ''تمہیں بھرم ہوا ہے بہن۔ مادھو جو یہاں کہاں ہو سکتا ہے۔ اُسے تو مرے ہوئے ایک سال ہو گیا۔ پچھلے سال جموں میں سانپ کے کاٹنے سے اُسکی موت ہو گئی۔'' ''نہیں'' وہ تڑپ کر کھڑی ہو گئی اور پھر سختی سے بولی۔

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ مادھو جو کبھی مر نہیں سکتا۔ وہ اندر بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

اس کہانی کے اقتباس کو پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دیپک کنول نے اس کہانی میں ایک درد کا سمندر سمو دیا ہے کہ قاری پڑھنے کے بعد ایک دم سکتے میں آ جاتا ہے۔ صحیح معنوں میں ایسی کہانیاں ایک حساس فنکار ہی لکھ سکتا ہے جس کے دل میں انسانیت کا درد اور تڑپ موجود ہو اور دیپک کنول ایک ایسے ہی کہانی کار ہیں جس کے دل میں انسانی ہمدردی کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ دیپک کنول نے اپنے تمام کرداروں کے ذریعے اپنی ہر کہانی کو ایک آئینے کی طرح قاری تک پہونچایا ہے۔ وہ چاہے ''رشتے'' کا علی پوا ہو۔ ''لالی کی مکھنی'' کا لال سنگھ ہو۔ ''بانگی مرغا'' کا کاشی وسکی ہو یا گل چرسی ''مچھی والی'' کی مریم ہو یا ''فاصلے'' کی زیتون۔ دیپک کنول نے ایک حساس اور بڑے فن کار کا رول ادا کیا ہے۔ دیپک کنول کی ہر کہانی میں اُن کا تجربہ، مشاہدہ اپنی پوری تخلیقی توانائی کے ساتھ ان کے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کرداروں میں موجود ہے۔ وہ بالکل اپنے کرداروں میں ایسے ڈوب جاتے ہیں کہ ایک ایک مکالمہ اُس کردار کی جیتی جاگتی تصویر بن جاتا ہے اور وہی پوری کیفیت قاری پر طاری کر دیتا ہے جو دیپک کنول کہنا چاہتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں سادگی اور جملوں میں وہ شگفتگی ہوتی ہے کہ قاری پڑھتے وقت کسی اُلجھن کا شکار نہیں ہوتا۔ اسے شمع کے معمے کی طرح حل کرنا نہیں پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی کہانیاں زیادہ متاثر کرتی ہیں۔ ''پمپوش'' اُن کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ یقین ہے کہ یہ مجموعہ بھی اُن کی دیگر کہانیوں کی طرح خوب مقبولیت حاصل کرے گا۔

سیفی سرونجی

سرونج۔ (بھوپال)

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کہتے ہیں اہل زبان

☆ آپ کے افسانوں میں میں نے منفرد انداز دیکھا ہے۔ ہر قاری کے ذہن میں احتجاج کرنے والے آپ کے افسانوں کے کردار ہوتے ہیں اور آپ جو موضوع پر قلم اُٹھاتے ہیں اُس سے انصاف کرتے ہیں۔ یہ چند سطور میں آپ کو خوش کرنے کے لئے نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ یہ حقیقت ہے۔ آپ نے اپنی ایک الگ شناخت بنالی ہے جو کسی ادیب کے لئے اُس کی مقبولیت کا ثبوت ہے۔ **مجتبی فہیم**۔ ایڈیٹر ماہنامہ ''رنگ و بو'' حیدرآباد

☆ دیپک کنول معاشرے کی اصلاح کرنے والا افسانہ نگار ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

فرید تنویر۔ مدیر ''ادبی کارواں'' ناگپور

☆ آپ کی تخلیقات معیاری ہوتی ہیں اور پسند بھی کی جاتی ہیں۔ **سعید رحمانی**۔ ایڈیٹر ''ادبی محاذ'' اُڑیسہ

☆ آپ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

نسرین نقاش۔ شاعرہ اور ایڈیٹر۔ ''صدا انٹرنیشنل'' سری نگر

☆ آپ کا مشاہدہ بہت اچھا ہے۔ یہ بات اور زیادہ اچھی ہے کہ آپ اپنے کردار نچلے طبقے سے اُٹھا لیتے ہیں۔ اُمید ہے آپ اسی طرح لگن سے لکھتے رہیں گے۔ **عنایت اختر۔ ممبئی**

☆ آپ کو طویل مدت سے پڑھتا رہا ہوں۔ زندگی کے سمندر کو مہارت کے ساتھ کہانی کا روپ دیتے رہے ہیں۔ احساسات اور تجربات کے تیزاب کو لطیف نازک بلوریں پیالوں میں ایمائیت کے آلیس کیوبز کے ساتھ سلیقے سے پیش کرنے کی ادا آپ کو معلوم ہے۔ **مناظر عاشق ہرگانوی**

☆ آپ کی کہانیاں پڑھ چکا ہوں۔ آپ کے یہاں وقوعی تانا بانا بڑا گنجان اور دلچسپ ہوتا ہے اور وارداتیں اعلیٰ انسانی قدروں کی عکاس۔ **جوگندر پال**

☆ آپ کی کہانیوں میں زندگی کی کڑوی سچائیوں کی بولتی ہوئی تصویریں نظر آتی ہیں جو قاری کو احساس کی الگ دنیا میں لے جاتی ہیں۔ تخلیق وہی کامیاب ہوتی ہے جو اپنے پڑھنے والوں کے قلب و ذہن پر گہرا اثر چھوڑ جاتی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہے اور مجھے یہ لکھتے ہوئے بیحد خوشی ہو رہی ہے کہ آپ کے افسانوں میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ایک اچھے افسانے کا حصہ ہوتی ہیں۔ **مراق مرزا۔ ممبئی۔**

☆ ترقی پسند دور کی کہانیوں میں پائی جانے والی جاذبیت اور مقناطسیت جو بعد میں لکھی جانے والی کہانیوں میں معدوم ہو گئی تھی اس کا Revival اب ہمیں دیپک کنول کی کہانیوں میں ملتا ہے۔ موصوف کی اب تک میں نے بیس سے زائد کہانیاں پڑھی ہیں اور سبھی سے محظوظ اور تازہ دم ہوا ہوں۔ **رفیق شاہین**

☆ افسانے کی زبان یہی ہونی چاہیے جو آپ کے افسانوں میں رواں دواں ہے۔ یہ فن کار کی فنکاری کا کمال ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں کرتی ہے اور بلا شک آپ نے اپنے فن کا مظاہرہ بڑی فن کاری کے ساتھ کیا ہے جس کیلئے یہ حقیر آپ کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہے۔ **لطیف جعفری۔** مدیر ہفت روزہ ''بیباک'' مالیگاؤں

☆ آپ کہانی کہنا جانتے ہیں۔ آپ کی کہانیاں دل پر دستک دیتی ہیں۔ آپ نے انسانی رشتوں کی اہمیت کو بخوبی سمجھا ہے۔ آپ کی تحریریں ذہنوں پر گہرا اثر چھوڑتی ہیں۔ **شرون کمار ورما۔** امرتسر (پنجاب)

☆ دیپک کنول کی کہانی ''ہار جیت'' اپنے اندر بے پناہ مثبت تاثر رکھتی ہے۔ گجرات کے بیک وقت کئی اسٹیجوں پر کھیلے جانے والے اس وسیع تر خونی ڈرامے کے ایک بہت چھوٹے لیکن لرزہ خیز واقعے کے ارد گرد دیپک کنول کے تخلیقی ذہن نے کہانی کے تانے بانے بنے اور اس تخریب سے تعمیر، تیرگی سے روشنی اور شیطانیت سے انسانیت کا پہلو برامد کرنے کے لئے کرداروں کا انتخاب کیا اور اپنی تخلیقی مہارتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے، ہر پہلو ایک بیحد درد انگیز، متاثر کن اور اپنے آپ میں درس انسانیت کا ایک ہمہ گیر تعمیری پہلو لئے ایک شاہکار اور منفرد کہانی عالم وجود میں لانے میں کامیاب رہے۔ **محبوب راھی۔** آکولہ مہاراشٹر

☆ دیپک کنول ایک جانے پہچانے کہانی کار ہیں۔ میں نے ان کی کہانیاں گاہے گاہے ادبی و نیم ادبی جریدوں میں پڑھی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم یہ کب سے لکھ رہے ہیں۔ میں نے ان کا پہلا افسانوی مجموعہ بھی نہیں دیکھا ہے۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ کب سے اس دشت خارزار کی سیاحت پر نکل آئے ہیں۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ میں نے ان کی کون سی کہانی کب اور کہاں پڑھی ہے لیکن اتنا جانتا ہوں کہ یہ نام میری یادداشت میں نامانوس نہیں ہے۔

غالب عرفان۔ (کراچی) پاکستان

☆ آپ ایک معروف اور ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ آپ نہایت اچھے ادبی افسانے تخلیق کرتے ہیں۔

نقشبند قمر نقوی بھوپالی۔ ادیب و مدیر رنگین مجلّہ ''روشنی'' امریکہ

☆ دیپک کنول کا نام تو جانا پہچانا ہی نہیں از بر نام ہے۔ کہانی اور دیپک کنول لازم و ملزوم ہیں۔ کہانی سے مراد اچھی اور پر مغز کہانی ہے ورنہ کہانی تو سبھی لکھتے ہیں۔ **یوسف ناظم** (مرحوم) ممبئی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

☆ایک سچا کہانی کار وہی ہے جو اپنے تجربات اور محسوسات کو خوبصورت ڈھنگ سے کہانی کے روپ میں پیش کردے۔ دیپک کنول نے جس ماحول میں آنکھ کھولی، جو کچھ اپنے آس پاس دیکھا۔ دن رات گولیوں کی آوازیں، سرحد پر رہنے والوں کی زندگی، اُن کے مسائل اُن کے دکھ درد کو جس طرح دیکھا محسوس کیا وہ جوں کا توں اپنی کہانیوں میں پیش کردیا۔ دیپک کنول کا اندازِ بیان متاثر کن ہی نہیں بلکہ مسحور کن بھی ہے۔

سیفی سرونجی۔ مدیر ''انتساب'' سرونج (بھوپال)

☆ آپ کو کافی عرصے سے پڑھ رہا ہوں۔ آپ کہنہ مشق رائٹر ہیں۔ ایوان اُردو میں اکثر افسانے پڑھتا رہتا ہوں۔

ڈاکٹر یوسف گوہر مدیر ''اُفق نو'' شاہجہاں پور۔ یوپی

☆میرے لئے آپ اجنبی نہیں ہیں۔ میں آپ کو پڑھتا رہا ہوں۔ ان دنوں بھی جب آپ ڈی۔ کے کنول تھے اور اب جب آپ دیپک کنول ہیں۔

سعید ظفر ہاشمی۔ رائٹر، ایڈیٹر ''گلبن'' لکھنو

☆ قارئین نے آپ کی گزشتہ کہانیوں کو پسند کیا ہے جو ہمارے لئے اور آپ کے لئے بھی طمانیت کا باعث ہے۔

ہارون بی۔ اے۔ مدیر ''ماہنامہ بیباک'' مالیگاؤں

☆ دیپک کنول کا ذہن ایک نہیں کئی کئی افسانوں کی تخلیق کے لئے بے چین رہتا ہے۔ اُنکی اسی اضطرابی کیفیت کو صداقت کا آئینہ مل چکا ہے۔ جس میں ہر وہ منظر دکھائی دیتا ہے جو سچے افسانے کی تخلیق پر کنول کو اُکساتا ہے۔ دیپک کنول کا ذہن موضوعات دیتا ہے اور قلم بیحد موثر انداز میں ان کے ہر افسانے کو صداقت کے سانچوں میں کچھ اس طرح ڈھال دیتا ہے کہ ہر افسانہ قاری کے دل کو متاثر کئے بنا نہیں رہ سکتا۔

ڈاکٹر عزیز اندوری۔ (اندور) مدھیہ پردیش

☆ تمہیں افسانہ لکھنے کا سلیقہ ہے۔ تمہارے موضوعات وہی ہیں جو تمہارے مشاہدے اور تجربے میں آتے ہیں۔ تمہارے تمام افسانوں میں انسانیت زندہ و تابندہ ہے۔ افسوس کہ تم فلموں میں اب تک وہ کامیابی حاصل نہ کر سکے جو تمہارا حق ہے حالاں کہ تمہیں دلیپ کمار جیسی عظیم شخصیت سے قربت رہی ہے۔

مظہر امام۔ دھلی

☆ آپ کا ایک افسانہ بہ نظر غائر میں نے ''قرطاس'' میں پڑھا۔ پہلی سطر میں قاری کے اندر جذب پیدا کرنے والی کیفیت پائی جاتی ہے۔ تاثر تلخ اور حقیقت سے قریب ترین ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ آپ کے قلم کی نوک میں کائنات کی نبض دھڑک رہی ہے۔ افسانہ پڑھنے کے بعد میری تڑپ کا اندازہ کیجئے کہ میں نے ناگپور مدیر ''قرطاس'' امین بھائی کو خط لکھ کر آپ کا پتہ منگوایا۔

جلیل بازید پوری۔ رائٹر ممبئی۔

☆ **کنیڈا** میں انڈو پاک کے ادبی جرائد کم کم نظر سے گزرتے ہیں۔ ایک وجہ ڈاک کا بھاری خرچ اور دوسری ذاتی پسند ناپسند بھی ہوسکتی ہے۔ بہر حال میری نظر سے گزرنے والے چند ادبی جرائد جن میں جناب دیپک کنول

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کی کچھ کہانیاں میں نے پڑھی ہیں۔ دیپک کنول صاحب کی بابت جہاں تک میں چند کہانیوں کے حوالے سے رائے قائم کر پائی ہوں وہ یہ ہے کہ وہ کہانی سے زیادہ احساس اور جذبات پر توجہ دیتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ سچے کہانی کار نہیں ہیں یا اُن کے ہاں کہانی موجود نہیں ہے۔ میں سمجھتی ہوں وقت اور عمر کے ساتھ اُن کے ہاں پختگی آتی جائے گی اور احساس و جذبات پر کہانی ضرور غالب آئے گی۔

بیگم اختر جمال (کنیڈا)

☆ بھائی دیپک کنول کشمیر جیسے حساس خطے کے باسی ہونے کے ناطے بیشتر کہانیاں سرحدی معاملات سے متعلق تحریر کیا کرتے ہیں جس سے اُن کے حساس دل اور دماغ کا پتہ چلتا ہے۔ میرے خیال میں اُنکے اندر ایک اچھا کہانی کار موجود ہے جسے زیادہ محنت اور ریاضت کی ضرورت ہے۔ اگر وہ اس جانب اسی محنت اور تن دہی سے گامزن رہے تو بہت جلد نمایاں کہانی کاروں میں شمار ہوں گے۔

پروفیسر ریاض صدیقی (کراچی، پاکستان)

☆ میں نے کنول صاحب کی کم و بیش نصف درجن کہانیاں مختلف ادبی جرائد میں بہت شوق اور توجہ سے پڑھی ہیں۔ میری خواہش ہے کہ میں مربوط شکل میں اُن کی کہانیاں پڑھوں اور واضح طور پر کوئی رائے قائم کر سکوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج کے دور میں کشمیری عوام اور کشمیری تہذیب و ثقافت کو جس خوبصورتی سے دیپک کنول صاحب اپنی کہانیوں میں پیش کر رہے ہیں وہ دوسرے کہانی کہنے والوں کے ہاں نظر نہیں آتا۔ اس حوالے سے اگر کنول صاحب کو نمائندہ کشمیری افسانہ نگار کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ **ڈاکٹر فیروز عالم (کیلی فورنیا)**

☆ میں نے دیپک صاحب کی کہانیاں بھی پڑھی ہیں اور برصغیر کے نامور اداکار یوسف خان عرف دلیپ کمار پر اُن کی مرتب کردہ کتاب ''دلیپ صاحب'' کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ مجھے اُن کا انداز تحریر بہت سادہ اور سچا لگا ہے۔ بات کو صحیح طریقہ اور طرزِ تحریر کو درست سمت میں سبک روی سے لے جانا اور قاری کے ذہن پر خاص طرح کا تاثر چھوڑنا دیپک صاحب کی تحریر کا خاصا ہے۔ اس حوالے سے میں اُن کا قاری بھی ہوں اور پرستار بھی۔

انوار شریف (لاہور پاکستان)

☆ میں نے ماہنامہ ''چہارسو'' راولپنڈی کے توسط سے دیپک کنول صاحب کی وہ سبھی کہانیاں پڑھی ہیں جو مختلف اوقات میں ''چہارسو'' شامل اشاعت کرتا رہا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ دیپک کنول صاحب کی کہانیاں سچائی اور ایمانداری کی پرچارک کہانیاں ہیں جن میں بناوٹ اور تصنع کا ذرہ بھر شائبہ نہیں ہوتا۔

فاری شا (لندن)

☆ دیپک کنول صاحب بھارت کے اُن افسانہ نگاروں میں نمایاں مقام کے حامل ہیں جو دونوں ملکوں کے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

درمیان محبت، دوستی اور بھائی چارے کو بڑھاوا دے رہے ہیں۔اُن کی کہانیوں کے مقام اور کردار بھی زیادہ تر دونوں ملکوں کی سرحد سے منسوب ہوا کرتے ہیں جن کے باعث اُن کی کہانیاں ہر دو جانب بسنے والے قاری کے دل پر اثر کرتی ہیں۔

عطیہ سکندر علی (سکھر، پاکستان)

☆ اکثر کہا جاتا ہے کہ اچھا اور بڑا ادب بڑے بحرانوں کے بطن سے پیدا ہوا کرتا ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُردو افسانے کی سو سالہ تاریخ میں جس قدر بحران ہنگامے فسادات، ظلم اور ناانصافیاں ہوئیں اُس کے مقابلے میں اچھے اور بڑے ادب کی مقدار اس قدر کم کیوں ہے۔دیپک کنول میرے بھائی بھی ہیں، دوست بھی ہیں، ہم درد و غم گسار بھی ہیں۔اس کے باوجود میں یہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں کہ وہ بڑے ادیب ہیں یا انھوں نے بڑا ادب تخلیق کیا ہے۔ہاں مگر میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے اب تک جس قدر بھی ادب تخلیق کیا ہے اُس کی بنیاد حق سچ پر مبنی ہے۔اسی باعث اُن کے افسانوں میں خاص طرح کا تاثر بلکہ تاثیر پائی جاتی ہے۔قاری کسی بھی عمر اور ذہنی سطح کا ہو دیپک کنول صاحب کی کہانیوں سے کسی نہ کسی قسم کا تاثر لے کر ضرور اُٹھتا ہے۔یہ ایسی خوبی ہے جو بہت کم تخلیق کاروں میں پائی جاتی ہے۔میں دیپک کنول صاحب کو اُن کی اسی خوبی اور کاوش پر مبارک باد پیش کرتے ہوئے اُردو ادب میں اُن کی بلند اقبالی کی دعا کرتا ہوں۔

گلزار جاوید۔مدیر ''چہارسو'' (راولپنڈی۔پاکستان)

☆ آپ کے افسانوں میں چناروں کی مہک، چشموں کا سنگیت اور کشمیر کی خوبصورتی جا بجا نظر آتی ہے جو دل کو لبھائے بنا نہیں رہتی۔زبان کی دلکشی بھی ہے، موضوع کی نزاکت بھی ہے اور انداز بیان بھی متاثر کرتا ہے۔

رینو بھل۔چنڈی گڑھ، پنجاب

☆ دیپک کنول عصر حاظر کے معروف افسانہ نگار ہیں۔ان کے افسانوں میں سطحیت نہیں بلکہ تجربے اور عصری زندگی کی جھلک نمایاں ہے۔یہی وجہ ہے کہ اُن کی شہر تزمینی حدود کو پھلانگتے ہوئے بین الاقوامی سطح پر شان بے نیازی سے اپنا لوہا منوا رہی ہے۔بطور افسانہ نگار ان کے یہاں موضوع، اسلوب، تکنیک، زبان و بیان کے ساتھ ساتھ مواد بھی نئی آویزشوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوتا ہے۔بطور ثبوت ایک کہانی ''سنتا کی گوری'' ہی کافی ہے۔

شجاع الدین شاھد۔ممبئی

☆ آپ کی کہانیوں کو قارئین بڑے چاو سے پڑھتے ہیں جسکے لئے ہم آپ کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

ھارون بی۔اے مدیر ماہنامہ ''بیباک''

☆ دیپک کنول کا افسانہ ''سنتا کی گوری'' بہت خوب افسانہ ہے جس میں دیہاتوں کی خوشبو ہے۔

ڈاکٹر کیول دھیر مطبوعہ۔''چہارسو'' راولپنڈی۔پاکستان

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

☆ دیپک کنول کا افسانہ ''سنتا کی گوری'' خیال افروز بھی ہے اور تقسیم کے المیے پر ایک عمدہ طنز بھی۔

خالد یوسف آکسفورڈ۔ مطبوعہ ''پرواز'' لنڈن

☆ دیپک کنول کا افسانہ ''سنتا کی گوری'' ایک اچھا افسانہ ہے۔

یو گیندر بھل تشنہ۔ دہلی۔ مطبوعہ۔ ''چہارسو'' راولپنڈی۔ پاکستان

☆ آپ کی عظیم شاہکار کہانی ''سنتا کی گوری'' دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گئی ہے۔ منشی پریم چند کا پس منظر لیکر آپ نے جو منظر نگاری اور کردار نگاری میں حقیقت کے رنگ بھرے ہیں اور کہانی کو کرشن چندر کے فکری اسلوبیاتی رنگوں اور دلچسپیوں سے جس طرح رنگا رنگ اور ہم آہنگ کیا ہے اور جس طرح جذبات کو برانگیختہ کرتے ہوئے معنی و مقصد کا اظہار کیا ہے وہ بلندی کمال کا ثبوت بے مثال ہے۔ کہانی بانگ دہل اعلان کر رہی ہے کہ آج کے زوال پزیر افسانوی دور میں کئی ایسے عظیم افسانہ نگار چھپے پڑے ہیں جن سے کرشن چندر، منٹو، بیدی اور عصمت کے سنہری افسانوی دور کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ **رفیق شاہین۔** علیگڑھ (یو۔ پی)

☆ ''سنتا کی گوری'' دراصل ایک گائے ہی نہیں بلکہ ہم لوگ اسے ماں کا درجہ دیتے ہیں، اسے پوجتے ہیں۔ ہر ہندو گھر میں گائے ایک برکتی چیز تسلیم کی گئی ہے۔ دیپک کنول نے گائے کو اُسی ماں کے روپ میں پیش کیا ہے۔ علامتی طور پر گوری کے کردار کو ایک ایسی عظمت بخشی ہے کہ جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ میں نے بیشمار کہانیاں پڑھی ہیں لیکن اس نوعیت کی کہانی نہیں پڑھی۔ ہندوستان میں ایسے لکھنے والوں کی بیحد کمی ہے جو قومی یکجہتی کے فروغ کو اپنا مسلک بنائیں۔ ایسی کہانی پڑھ کر میں گہری سوچ میں مبتلا ہو گیا ہوں۔

انل اگروال۔ سرپرست سہ ماہی ''انتساب'' سرونج۔ ایم۔ پی

☆ یہ کہانی ان سیاست دانوں پر بھرپور طمانچہ ہے جو آئے دن سرحدوں کے اس پار اور اُس پار تماشے دیکھتے رہتے ہیں جو دراصل سیما کی سی نمود رکھتے ہیں لیکن انسانیت بہر حال مجروح ہوتی ہے۔ دیپک کنول نے اپنی کہانی کی اساس ان حقائق پر رکھی ہے جن سے وہ دوچار رہے ہیں کیونکہ ایک حساس ادیب رونما ہونے والے واقعات کو نمائش بین کی حثیت سے نہیں دیکھتا بلکہ ان واقعات کے مناظر اور مستقبل کے آئینے میں بھی انہیں منعکس دیکھتا ہے اس لئے وہ سچ کا برملا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہانی کار کا کمال یہ ہے اس نے مرکزی کردار ایسا منتخب کیا کہ جو دو ثقافتوں کے درمیان فیہ ہے، اگرچہ کہ وہ انسانی کردار نہیں ہیں لیکن انسان کی حقیقت و خواہش کا محور ہے۔ اسی کمزور دھاگے کے سہارے کہانی کی ایسی ریشمی چادر تیار ہوئی ہے کہ عقل حیران ہے۔ کہانی کی یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اس چادر نے انسانیت کی آبرو کو بچا رکھا ہے۔

ڈاکٹر مختار شمیم۔ مطبوعہ۔ سہ ماہی ''انتساب'' سرونج ایم۔ پی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

☆ آپ کا افسانہ ''سنتا کی گوری'' بہت اچھا افسانہ ہے۔ مبارکباد۔ وقت کی آواز پر آپ نے انتہائی اثر انگیز افسانہ تحریر کیا ہے۔ آج کی سب سے بڑی ضرورت ہندو پاک کے رشتوں کو اُستوار کرنا ہے اور نفرتوں کی خلیج کو پیار و محبت سے پاٹنا ہے اور یہ کام قلمکار سے بہتر کوئی انجام نہیں دے سکتا۔

سعید ظفر ہاشمی۔ مدیر ''گلبن'' لکھنو۔

☆ ویسے تو میں دیپک کنول کے افسانوی مجموعے ''برف کی آگ'' پر کافی پہلے سہ ماہی انتساب (شمارہ نمبر ۵۰) میں تبصرہ کر چکا ہوں، اس وقت بھی دیپک کنول کے افسانے مجھے بہت اچھے لگے تھے، کیونکہ ان میں احساس کی شدت اور کہانی کہنے کا انداز بہت اچھا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس نے حالات کو بچشم خود دیکھا ہو اور اس کے اندر حساس دل بھی ہے تو اس کے بیان میں تاثیر کا ہونا ایک فطری عمل ہے۔ دیپک کنول کی کہانی ''سنتا کی گوری'' ہند و پاک کے صرف زمینی ہی نہیں بلکہ ذہنی تقسیم کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ ملک تقسیم ہوا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ سگے بھائیوں میں بھی ایک دن بٹوارہ ہو جاتا ہے۔ یہ دنیا کی پرانی ریت ہے لیکن دکھ کی بات تو یہ ہے کہ زمینی بٹوارے نے ذہنیتوں کو بھی بدل کر رکھ دیا ہے۔ یہ ہندو پاک کی بہت بڑی بدقسمتی ہے۔ یہ سب جال پھیلایا ہوا سیاستدانوں کا ہے کیونکہ انہوں نے آپسی محبت و بھائی چارے کے بیچ نفرت و دشمنی کو بڑھاوا دیا۔ دیپک کنول نے گائے اور بچھڑے کی مدد سے تقسیم شدہ ملک میں رہنے والوں کی ذہنیتوں کو بڑی بے باکی کے ساتھ بیان کیا ہے اور پھر دیپک کنول کا انداز بیان جو متاثر کن ہی نہیں مسحور کن بھی ہے۔ دیپک کنول نے اس نمائندہ افسانے کے ذریعہ اخوت و بھائی چارے کی فضا ہموار کرنے کی سعی کی ہے جو ایک قابل صد ستائش عمل ہے۔

ادیب و نقاد **محمد متین ندوی**۔ مطبوعہ۔ ''سہ ماہی انتساب'' سرونج۔ ایم۔ پی۔

☆ سچائی تو یہ ہے کہ دیپک کنول کی یہ کہانی اُردو ادب میں ایک بالکل منفرد کہانی ہے۔ تعریف کی بات یہ ہے کہ موضوع کوئی نیا نہیں ہے لیکن ''سنتا کی گوری'' کا سرحد پار جانا اور دشمن کے علاقے میں ایک بچھڑے کو جنم دینا، پھر ایک سال بعد بچھڑے کے ساتھ واپس آ جانا، سنتا کا بچھڑے سے نفرت کرنا کہ اس بچھڑے کا جنم دشمن کے علاقے میں ہوا ہے اس لئے اُس پر دشمن کے اثرات ہونگے، اسے قبول نہ کرنا اور اُسے سرحد پار دھکیل دینا اور پھر بچھڑے کے غم میں گوری کا گھاس نہ کھانا اور سنتا کا بعد میں پچھتانا اور یہ وعدہ کر کے جانا کہ اب میں تیرے بچھڑے کو لے کر ہی آؤں گا، خطرات سے دشمن کے علاقے میں جانا اور پھر ماں سے بچھڑے کو ملانے میں اپنی جان قربان کر دینا، اس کہانی میں گائے کو ماں کے روپ میں پیش کر کے دیپک کنول نے کہانی کو کوئی دوسرا ہی روپ دے دیا ہے اور اشاروں کنایوں، مکالموں کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستان ایک ماں کے سائے کی طرح ہے تو پاکستان اولاد کی طرح۔ کاش سرحد ہی نہ ہوتی۔ سب ایک دوسرے سے مل جل کر رہتے۔ کسی ماں کو اپنے بچے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کی یاد میں آنسو نہ بہانے پڑتے۔ کہانی کے ایک ایک جملے میں یہی تڑپ یہی دردعیاں ہے اور پھر اہم بات یہ ہے کہ دیپک کنول کے کہنے کا انداز جس سے کہانی میں اور بھی تاثیر پیدا ہوگئی ہے، اسلئے کہ وہ سنتا کی گوری ہی نہیں ایسے سینکڑوں لوگ آج یہاں موجود ہیں جن کے بچے وہاں ہیں، تو ماں باپ یہاں ہیں۔ دونوں ملکوں کے درمیان میل جول اور محبت کو بڑھاوا دینے والی شاہکار کہانی ہے۔ ایک سچا کہانی کار وہی ہے جو اپنے تجربات اور محسوسات کو خوبصورت ڈھنگ سے کہانی کے روپ میں پیش کردے۔ ''سنتا کی گوری'' ایک ایسی کہانی ہے جس میں کہانی کار نے سرحد پر رہنے والے سنتا کے ذریعے انھیں ان سارے سرحد پر رہنے والوں کے دکھ درد کو محسوس کرنے کے لئے اپنی کہانی پیش کردی کہ ہمارے ذہن ودل میں انکے لئے نہ صرف ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوا بلکہ قاری کے دل پر ایک جھٹکا لگتا ہے اور وہ ساری سرحدوں کو پار کرکے ایک دوسرے کے گلے ملنے کے لئے بے چین ہوجاتا ہے۔ مضمون ''ترقی پسند تحریک کے بعد اُردو افسانہ'' سے لیا گیا اقتباس۔ مضمون نگار، سیفی سرونجی: مدیر ''انتساب'' سرونج (اس کہانی کا انتخاب 2007 کی بہترین کہانیوں میں ہوا ہے۔ یہ کہانی ''چہارسو'' راولپنڈی پاکستان ''گلبن''، لکھنو، ''پرواز'' لنڈن، اور ''عالمی ادب'' دلی میں اب تک شائع ہوئی ہے۔)

☆ دیپک کنول کا افسانہ ''لالی کی مکھنی'' پڑھکر مجھے افسانہ نگار رفیق حسین بے اختیار یاد آئے جو بالعموم جانوروں کی نفسیات پر شاہد احمد دہلوی کے رسالہ ''ساقی'' میں افسانے لکھتے تھے۔ اُن کے افسانوں کا مجموعہ ''آئینہ حیرت'' ایک زمانے میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب شمار ہوتا تھا۔ دیپک کنول کا افسانہ بنیادی طور پر لال سنگھ ڈرائیور اور اُس کی بیوی گورمیت کا افسانہ ہے جو اولاد سے محروم ہیں۔ مکھنی ہرن کا بچہ ہے جو لال سنگھ کو ایک جھاڑی کے پیچھے بے سدھ پڑا ملا تھا۔ وہ ہرن کے اس بچے کو گھر لے آیا۔ مکھنی اس گھر میں پرورش پاتی ہے اور گھر کا فرد شمار ہونے لگتی ہے لیکن پھر شہر میں فسادات پھوٹ پڑتے ہیں اور لال سنگھ کے لئے نقل مکانی لازمی ہوجاتی ہے تو وہ مکھنی کو جنگل میں چھوڑنے جاتا ہے تو سیکورٹی والے اُسے دہشت گرد سمجھ کر ہلاک کردیتے ہیں۔ کشمیر کے انسانیت سوز واقعات میں یہ افسانہ امن وآشتی کا مرغزار ہے اور ایک حیوان کو انسان پر فوقیت دے دیتا ہے۔ اس افسانے میں انسان وحشی نظر آتے ہیں لیکن حیوان کے باطن میں انسانی محبت کا چشمہ موجود ہے۔ ''لالی کی مکھنی'' کو اس برس کے بہترین افسانوں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

انور سدید۔ نقاد (پاکستان) بشکریہ ''تخلیق'' لاہور۔ پاکستان

☆ مدت بدید دیپک کنول کی کہانی پڑھنے کو ملی۔ کشمیری ادیب دنیا کے کسی کونے میں رہتا ہو ذہنی طور پر وہ کشمیر کی وادیوں میں محوگشت ہوتا ہے۔ کنول کی کہانی خوب ہے اظہار کی سادگی، ماشااللہ۔ کہانی کا طرز بیان واہ واہ۔

فاروق نازکی۔ شاعر وسابقہ ڈائرکٹر دوردرشن سری نگر۔ بشکریہ ''لفظ لفظ'' اننت ناگ۔ کشمیر

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

☆''لالی کی مکھنی'' حالیہ دہشت گردی کے حوالے سے ہمیں لمحہ فکر عطا کرتی ہے۔

جمیل آذر۔(پاکستان) مطبوعہ۔''تخلیق'' لاہور پاکستان۔

☆بہت عرصے بعد دلوں کو چھونے والا افسانہ ''لالی کی مکھنی'' مطالعے کو ملا۔ دیپک کنول بلاشبہ انسان دوست لکھاری ہیں۔ میں اُس کے افسانے کے سحر میں گم ہوں۔ دل کا مریض ہونے کے سبب بہت دیر تک میں اندوہ میں ڈوبا رہا۔ اُس نے جس انداز سے دہشت گردی کے حوالے سے انسان کے قتل کو پیش کیا ہے وہ افسانے کا نیا Trend ہے۔ میں اُس کے افسانے پر بہت کچھ لکھنا چاہتا تھا مگر دل کے آپریشن اور نظر کی کمزوری کی بنا پر فی الوقت دیپک کنول کو دعائیں پیش کرسکتا ہوں۔ پرماتما اُس کے قلم کو رواں دواں رکھے۔ (آمین)

رشید نثار۔ پاکستان۔ مطبوعہ ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور۔ پاکستان

☆''لالی کی مکھنی'' دیپک کنول کا افسانہ انسانی جذبات سے مربوط ایک عمدہ تحریر ہے۔

سجاد مرزا۔ پاکستان۔ مطبوعہ ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور، پاکستان

☆''لالی کی مکھنی'' کے لئے دیپک کنول کو مبارک باد۔ خدایا! ایسا بانکپن سلامت رہے۔

طفیل اختر۔ مدیر، ماہنامہ ''مسکراہٹ'' لاہور، پاکستان

☆''لالی کی مکھنی'' بہت پسند آیا۔ محبت کا جذبہ انسانوں میں ہی نہیں، حیوانوں میں بھی موجود ہے۔ صرف ماحول کی بات ہے۔ اگر حیوانوں کو بھی انسانوں کا ماحول مل جائے تو وہ بھی ان کے ساتھ رہنا پسند کریں گے۔ یہاں ہرن کی جگہہ اگر چیتے کا بچہ بھی ہوتا تو وہ بھی اپنی وحشیانہ حرکتیں بدل دیتا۔ گورمیت نے مکھنی کو اپنی اولاد کی طرح پالا تو اُسنے بھی اُسے گھر نہ چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ دونوں کے دل میں ایک دوسرے کی محبت، گھر کی محبت، ماحول کی محبت، گاؤں کی محبت اکھٹی پروان چڑھی اور دونوں ہی انکی محبت میں ایک جیسے گرفتار ہوگئے مگر انسان وحشی ہوجائے تو کیا کیا جائے۔ **آفتاب راجا**۔ پاکستان۔ مطبوعہ، ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور، پاکستان۔

☆''لالی کی مکھنی'' ایک تاثیر آفرین کہانی ہے۔ مٹی کی محبت سے سرشار یہ افسانہ ایک بیانیہ ہونے کے باوصف رمز وایما سے متصف ہے۔ اس افسانے میں بیک وقت کئی مسائل کو موضوع قلم بنایا گیا ہے۔ ہر چند افسانے کی بنیادی جہت بے اولاد ہونے کا غم ہے تاہم اس غم میں بٹوارے کا دکھ شامل کرکے دو آتشہ بنادیا گیا ہے۔ لالی اور گورمیت دونوں کردار جاندار اور متحرک ہیں۔ کہانی کا بہاو فطری اور مکالمے حقیقی کیفیت کے غماز ہیں۔

قیصر نجفی، پاکستان۔ مطبوعہ، ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور، پاکستان

☆''لالی کی مکھنی'' خوبصورت انداز اور دردناک موضوع پر مشتمل ہے۔

صائمہ نورین بخاری۔ پاکستان۔ مطبوعہ، ماہنامہ ''تخلیق'' پاکستان

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

☆ ترقی پسند دور کی کہانیوں میں پائی جانے والی جاذبیت اور مقناطیست جو بعد میں لکھی جانے والی کہانیوں میں معدوم ہوگئی تھی اس کا Rrvival اب ہمیں دیپک کنول کی کہانیوں میں ملتا ہے۔ان کی کہانی ''لالی کی مکھنی'' بھی جو منشی پریم چند کی یاد دلا دیتی ہے، ایک ایسی ہی دلگداز، جذباتی اور دل میں اُتر جانے والی کہانی ہے۔

رفیق شاھین ،علیگڑھ (یو۔پی) مطبوعہ ماہنامہ ''لفظ لفظ'' اننت ناگ کشمیر۔ یہ کہانی پہلے سہ ماہی ''انتساب'' سرونج میں چھپی۔ یہاں کے نقادوں نے اس پر کچھ لکھنا شایان شان نہ سمجھا۔ پھر یہ کہانی ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور پاکستان میں چھپی۔ وہاں اس کہانی کی خوب پزیرائی ہوئی۔ابھی حال حال میں ہی یہ کہانی ماہنامہ ''لفظ لفظ'' اننت ناگ کشمیر میں چھپی۔اس بار کچھ لوگوں نے اس کہانی کو خوب سراہا]

☆ بٹوارے کے دکھ سے مملو، دیپک کنول نے ایک تاثر آفرین کہانی لکھی ہے۔اس کہانی میں کردار نگاری پر افسانہ نگار نے خصوصی توجہ مرکوز رکھی ہے۔''نانی خیروالی'' کے علاوہ ''فرضی بوا'' کا کردار بھی یاد رہ جانے والا ہے۔

قیصر نجفی، (کراچی) مطبوعہ، ماہنامہ ''چہارسو'' راولپنڈی۔(پاکستان)

☆ ''نانی خیروالی'' ایک ایسا کردار ہے جو گاوں کا وقار، گاوں کی عزت، سب کا بھلا چاہنے والی، سب کے دکھ درد بانٹنے والی، گاوں کی خوش حالی برقرار رکھنے والی ہے لیکن جب گاوں میں آتنک کا قہر برستا ہے تو نانی یہ غم برداشت نہیں کر پاتی اور وہ موت کی آغوش میں چلی جاتی ہے۔ دیپک کنول نے ایک حساس کہانی کار بن کر اُس کیفیت کو اُس کردار میں ڈھال دیا ہے جو امن وسکون کا شیدا ہے۔ان کی ساری کہانیوں میں اپنے جنت نما وطن کی حالت دیکھ کر جو تکلیف، جو درد محسوس کیا ہے، اُس کی تڑپ اُن کی کہانیوں کے ایک ایک کردار میں دیکھی اور محسوس کی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر سیفی سرونجی۔شاعر، نقاد اور مدیر ''سہ ماہی انتساب'' سرونج، ایم۔پی۔

☆ آج کل بعض کہانیاں ایسی بھی لکھی جارہی ہیں جن میں کہانی پن کے باوجود کسی مرکزی کردار پر فوکس کیا جاتا ہے جس سے مکمل خاکہ اُبھر آتا ہے۔یوں دو اصناف مشترک ہو کے افسانہ نما خاکہ یا خاکہ نما کہانی بن جاتے ہیں۔چنار کے درخت کا استعارہ۔''نانی خیروالی'' تمام تر جزئیات کے ساتھ رواں دواں اچھی پیشکش ہے۔

شگفتہ نازلی، لاہور۔مطبوعہ ماہنامہ ''چہارسو'' راولپنڈی۔(پاکستان)

☆ دیپک کنول صاحب کا نام میرے لئے نیا نہیں ہے۔اکثر رسائل و جرائد میں ان کے افسانے میری نظروں سے گزرے ہیں۔کہانی ''بانگی مرغا'' کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے اطمینان ہو رہا ہے کہ جو باتیں میں نے کہانی کی کامیابی کیلئے ضروری ٹھہرا رکھی ہیں اُن باتوں کو اُنہوں نے اپنی کہانی میں پیش نظر رکھا ہے۔کہانی کے خاص کردار ''گل چرسی'' ''چونی وسکی'' اور ''پپو سنگھ'' کے ذریعے جو مواد پیش کیا گیا ہے وہ مواد ''ان ہونی'' کا جواز نہیں بنتا۔دو شرابیوں نے شراب کے نشے میں اپنی اپنی سمجھ کی باتیں پیش کر کے کہانی میں دلچسپی کا پہلو قائم کر دیا ہے۔پھر یہ کہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کنول صاحب نے خود کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا ہے بلکہ یہ کام قاری پر چھوڑ دیا ہے۔ یوں یہ کہانی اچھے خطوط پر رواں ہے۔ یہی اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔ **ایوب واقف**، نیو ممبئی (مہاراشٹر)

☆ آپ کا اچھوتا افسانہ ''بانگی مرغا'' مطالعہ سے گزرا جو میرے پورے کنبہ افراد کے لئے باعث فرحت ثابت ہوا۔ دوران مطالعہ جب راقم کے منہ سے ہنسی کی پھوار چھوٹی تو بڑے پوتے نے پوچھا کہ دادا جی ایسی کیا بات ہے جو آپ بے ساختہ کھلکھلا اُٹھے۔ راقم نے یہ افسانہ افراد کنبہ کو پڑھ کر سنایا۔ ایک عجیب ماحول درون خانہ وارد ہو کر کیف وانبساط کا باعث بنا۔ مبارک۔ صد مبارک۔ **عشاق کشتواڑی**۔ جانی پورہ، جموں

☆ دیپک کنول: میرے پسندیدہ افسانہ نگار ہیں۔ مذہبی جہالت اور تنگ نظری پر اُن کی کہانی ''بانگی مرغا'' مجھے بیحد پسند آئی۔ **رفیق شاہین**۔ علی گڑھ (یو۔پی)

☆ دیپک کنول کا ''بانگی مرغا'' میں جو طنز ملیح ہے اس نے افسانے کو نہ صرف دلچسپ بنایا ہے بلکہ اُس کی فکر انگیزی میں اضافہ کر دیا ہے۔ ماضی قریب میں تجریدیت اور ابہام کی یلغار نے ہمارے افسانوں سے کردار غائب کر دیا تھا۔ ''بانگی مرغا'' میں گل چرسی اور کاشی وسکی جیسے حقیقی کرداروں کو دیکھ کر خوشگواری کا احساس ہوتا ہے۔ دیپک کنول بہت صاف ستھری زبان لکھتے ہیں۔ ''بانگی مرغا'' کا بیانیہ بھی ایسا رواں دواں ہے جیسے ڈل جھیل میں شکارا سبک رفتاری سے تیر رہا ہو۔ اس خوبصورت افسانے کے لئے دیپک کنول یقیناً مبارکبادی کے مستحق ہیں۔

سلام بن رزاق۔ ممبئی۔

☆ دیپک کنول کی کہانی پڑھ کر وہ دور یاد آجاتا ہے جب افسانہ اپنے معراج پر تھا۔

رئیس الدین رئیس۔ علی گڑھ۔ (یوپی)

☆ میرا ایک ہمسایہ محمد رمضان جو کہ پہلے جموں وکشمیر سٹیٹ روڈ کارپوریشن میں بحیثیت ڈرائیور کام کرتا تھا اور بعد میں کارپوریشن کی طرف سے والنٹیر لی رٹائرمینٹ سکیم کے تحت ریٹائر ہو گیا۔ میں نے اُس کو دیپک کنول کا افسانہ ''بانگی مرغا'' پڑھ کر سنایا۔ جب میں نے اُسے ''بانگی مرغا'' میں گل چرسی اور کاشی وسکی کا قصہ سنایا تو وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ افسانہ مکمل ہوا تو میں نے دیکھا اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اُسے اپنے ایک پرانے ساتھی ڈرائیور شمبھو ناتھ کی یاد آگئی تھی جو وادی میں رونما ہوئے حالات کی وجہ سے جموں چلا گیا تھا اور وہاں سانپ کے ڈسنے سے مر گیا تھا۔ محمد رمضان کو روتے دیکھکر مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ دیپک کنول کے افسانے میں کتنی اپیل ہے۔ دیپک کنول کو میرا اشکوں بھرا اسلام۔ **محمد شفیع ایاز**۔ اننت ناگ۔ کشمیر

☆ اُردو ادب کا کوئی بھی قاری دیپک کنول کے نام سے ناواقف نہیں ہو سکتا۔ معتبر رسائل اور جرائد میں آپ کو ایک عرصے سے پڑھتا آرہا ہوں۔ ''رشتے'' خوبصورت افسانہ ہے اور بلاشبہ اس کے کردار اجنبی نہیں ہیں۔ پلیڈیم

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

سینما میں فلم دیکھنے والے شائقین علی پوا کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ افسانہ پڑھکر اُسکا خوفناک چہرہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور کئی کھٹی میٹھی یادیں اُبھر کر آ گئیں۔ **ابن اسمائیل**۔ افسانہ نگار و مدیر ''بزم ادب'' سری نگر۔ کشمیر

☆ ذاتی طور پر میں ایک ایسی افسانہ نگار یا تذکرہ نویس ہوں کہ جسے مذہبی تنازعات، علاقائی چپقلش یا سیاسی منافرت کے موضوعات سے کوئی علاقہ نہیں۔ میرے نزدیک یہ سب گورکھ دھندے اس زمین پر چند ذہنی مریضوں کی پھیلائی ہوئی ''سیاسیات'' ہے اسلئے میں ایسے موضوعات پر قلم اُٹھانا کارِ لایعنی گردانتی ہوں۔ میرا کوئی کالم، کوئی افسانہ یہاں تک کہ تجزیے اور تزکرے بھی اس ادبی علت سے پاک ہوتے ہیں۔ یہ زکر اسلئے ہوا کہ جو فراخدلانہ خوشی مجھے دیپک کنول کی فرمائش پر ہوئی تھی وہ افسانہ ''فاصلے دیکھ کر گھٹ سی گئی، جس سے تنازعہ کشمیر کی وحشت ٹپکتی محسوس ہوء۔ لیکن جوں جوں میں افسانہ پڑھتی گئی یہ تاثر زائل ہوتا چلا گیا کیونکہ افسانہ کسی سیاست دان ذہنی مریض نے نہیں بلکہ ایک ''سچل' افسانہ نگار نے لکھا تھا جس میں علاقائی تنازعے سے ہٹ کر ایک سیدھی سادھی کہانی کا بیان ہے، کہ کچھ حالات اس زمین کے سماجی مسائل کی کوکھ سے جنم لینے سے پہلے ہی اپنی موت آپ مر جاتے ہیں۔ زیتون (جو ایک ماں کا استعارہ ہے) سے جب اُس کے شیر خور بیٹے کو حالات نے جدا کرنا چاہا تو یہ ایسا ہی تھا جیسے ناخنوں سے گوشت جدا ہو یا پھر کلیجے کو سینے سے کھسوٹ نوچ لیا جائے۔ یہ افسانہ جس نے دو بھائیوں کے 'فاصلے' کی کہانی شروع کی تھی، اپنا انجام قہر خداوندی سے جوڑتا نظر آتا ہے جو 8 اکتوبر 2005 کی اپنی منحوس تاریخی تباہی کی صورت میں ہمارے حافظوں سے چمٹ کر رہ گیا ہے۔ دیپک کنول ایک کشمیری قلمکار ہیں اور مذکورہ افسانہ بھی ان کی کشمیریت کا عکاس ہے۔ گو زیادہ تر افسانہ بیانیہ انداز لئے ہوئے ہے لیکن وحدتِ تاثر کو بڑھانے کے لئے کسی کامیاب افسانہ نگار کی طرح دیپک کنول نے مکالماتی انداز سے بھی کام لیا ہے۔ دیپک کنول کے قلم میں انسان کے بارے میں جو پر درد مشاہداتی طرز اسلوب ہے یہ انہیں بہت آگے لے جائے گا کیونکہ کسی کامیاب قلم کار کے لئے یہ بہت بڑا عطیہ خداوندی ہے۔

فرخ صابری۔ لاہور۔ بشکریہ ہفتہ وار ''زنجیر'' لاہور اور ماہنامہ ''مسکراہٹ'' لاہور پاکستان

☆ دیپک کنول کا ''فاصلے'' تو ایک یونیک موضوع کا بہترین افسانہ ہے۔ ابھی تک تو میں نے انسان کی زندگی میں ہونے والے ایسے مدوجزر کی کہانی نہیں پڑھی۔ **صفیہ صدیقی**، لندن۔ مطبوعہ ''پرواز'' لندن

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

لالی کی مکھنی

لال سنگھ عرف لالی بارہمولہ کا ایک خوش باش ٹرک ڈرائیور تھا جو حاجی صمد ڈار کا ٹرک چلا لیا کرتا تھا۔ حاجی صمد ڈار قصبہ سوپور کا ایک صاحب ثروت آدمی تھا جس کے یہاں بیس پچیس کارندے ہر دم دوڑتے بھاگتے نظر آتے تھے۔ ہر سال وہ لاکھوں ٹن ڈیلیشیس سیب دلی کی منڈیوں کو فراہم کرتا تھا۔ اُس کے چار چھ ٹرک مہینے کے تیس دن سرینگر دلی شاہراہ پر دندناتے ہوئے نظر آتے تھے۔ لالی کو چھوڑ کے باقی سبھی ڈرائیوروں سے پائی پائی کا حساب لیا جاتا تھا لیکن اس محاسبے کے باوجود وہ مالک کی آنکھوں میں ایسے دھول جھونک لیا کرتے تھے کہ مالک تو مالک فرشتوں کو بھی اس ہیرا پھیری کی خبر نہیں لگ جاتی تھی۔ ایک لالی تھا جو اس احتساب کے دائرے سے باہر تھا۔ کوئی بھی نوکر اُس سے حساب مانگنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ حاجی کی ناک کا بال تھا۔ پر اتنی قرابت داری ہونے کے باوجود وہ ایک پیسے کی بے ایمانی نہیں کرتا تھا۔ جو کچھ کما کے لاتا تھا وہ منشی کے منہ پر مار دیتا تھا۔ چنانچہ اُس کی ایمانداری کو دیکھ کر آج تک کوئی بھی ملازم اُس کے کردار پر اُنگلی نہیں اُٹھا پایا تھا۔ شاید اُس کی ان ہی خوبیوں نے اُسے حاجی کا چہیتا بنا دیا تھا۔

لالی شادی شدہ تھا پر ابھی تک اُس کی بیوی گورمیت کور کی گود ہری نہ ہونے پائی تھی۔ گورمیت کور بھی اپنے شوہر کی طرح ہی بڑی ہنس مکھ اور جی دار عورت تھی۔ جب بھی کبھی رشتے ناتے میں کسی کے یہاں کوئی آفت آفتاد پڑتی تھی تو گورمیت سب سے پہلے سدھ لینے پہونچ جایا کرتی تھی۔ ظاہر میں تو وہ دھان پان سی عورت تھی مگر دل گردہ کسی جیالے مرد سے کم نہ تھا۔ اتنی ککڑی ہونے کے باوجود وہ دس بیس آدمیوں سے لڑنے بھڑنے کا دم خم رکھتی تھی۔ لالی کو گورمیت کی اس مردانگی پر ناز تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہفتوں اُسے گھر میں اکیلے چھوڑ کر جاتا تھا اور اُسے اُس

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کی زرا بھر بھی فکر نہ ہوتی تھی۔

لالی کو تو بس ایک ہی غم کھائے جا رہا تھا کہ شادی کے چار سال گزر جانے کے باوجود گورمیت اب تک ماں نہ بن پائی تھی۔ اُسنے حاجی کی صلاح پر کئی لیڈی ڈاکٹروں سے رجوع کیا۔ پیر فقیروں کے گنڈے تعویذ آزمائے۔ کئی آستانوں پر جا کر دھاگے باندھے مگر اتنا سب کچھ کرنے کے بعد بھی گورمیت کور کی کوکھ بنجر کی بنجر ہیر ہی۔ رات کو جب بھی کہیں محفل جمتی تھی تو وہ پی پا کے اپنے دل کا درد اُگل دیتا تھا۔ یار دوست جھٹ سے مشورہ دینے لگتے تھے کہ وہ گورمیت کو چھوڑ کے کسی اور سے بیاہ رچا لے۔ لالی گورمیت کو چھوڑنے کے خیال سے بپھر اُٹھتا تھا۔ وہ اپنے سنگی ساتھیوں کو من بھر کی گالیاں دے کر وہاں سے اُٹھ کر چلا جاتا تھا۔ دراصل وہ گورمیت کو جنونکی حد تک چاہتا تھا۔ اُسکو چھوڑنے کے خیال سے ہی وہ تڑپنے اور تلملانے لگتا تھا۔

ایک دن جب وہ جموں سے سری نگر لوٹ رہا تھا تو پتنی ٹاپ پر اُسنے پانی پینے کی غرض سے اپنا ٹرک کھڑا کیا۔ پتنی ٹاپ کی یہ پہاڑی چیل اور دیودار کے پیڑوں سے چاروں طرف سے گھری ہوئی ہے۔ یہاں کا ٹھنڈا پانی روح کو سیراب کر دیتا ہے۔ اُسنے پانے کے جھرنے کے نیچے کھڑے ہو کر اوک سے پانی پی لیا۔ جب وہ پانی پی کر اپنے ٹرک کی جانب بڑھنے لگا تو اچانک اُس کی نظر ایک ہرن کے بچے پر پڑی جو ایک جھاڑی کے پیچھے بے سدھ پڑا تھا۔ اُسنے آگے بڑھکر ہرن کے بچے کو ہلا جھلا کر دیکھ لیا۔ یہ دیکھ کر اُس نے طمانیت کا سانس لیا کہ وہ ابھی تک زندہ تھا۔ اُسنے اُسے گود میں اُٹھا لیا اور ادھر اُدھر دیکھ کر وہ اس بچے کو ٹرک میں ڈال کر وہاں سے چلتا بنا۔ راستے میں ہرن کے بچے کو ہوش آ گیا اور وہ اپنی ٹانگیں ہلانے جھلانے لگا۔ لالی نے بٹوت میں جا کر اپنا ٹرک ایک دوکان کے آگے روک لیا اور پھر وہ ٹرک سے اُتر کر ایک دودھ کی بوتل خرید کر لے آیا۔ وہ یہ بوتل لے کر پپو سنگھ ڈھابے والے کے پاس چلا گیا اور اُس سے آدھا لیٹر دودھ گرم کرنے کے لئے کہا۔ سردار پپو سنگھ دودھ کی بات سن کر ہنس پڑا اور چھیڑنے والے انداز میں بولا۔ ''کے پاپا جی! جنگل دے شیر بھی دودھ پین لگے کیا؟''

''فالتو گلاں نہ کر۔ آدھا لیٹر دودھ چھیتی (جلدی) گرم کر کے دے۔'' وہ پپو سنگھ کو پیار سے ڈانٹتے ہوئے بولا۔

پپو سنگھ نے دودھ گرم کروا دیا اور لالی نے یہ دودھ بوتل میں ڈالا اور تب تک اسے ہلتا رہا جب

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

تک یہ دودھ ٹھنڈا نہ ہوا۔ وہ دودھ کی بوتل لے کر ٹرک میں سوار ہوا اور پھر ہرن کے بچے کو اپنی اولاد کی طرح گود میں بٹھا کر اُسے دودھ پلانے لگا۔ ہرن کا بچہ بہت بھوکا تھا اسلئے منہ میں نپل ڈلتے ہی وہ جھپ جھپ چسر چسر کے دودھ پینے لگا۔ اس بچے کو اسطرح دودھ پیتے دیکھ کر لالی کی آنکھوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ بڑے آرام اور یکسوئی سے اُسے تب تک دودھ پلاتا رہا جب تک وہ شکمسیر نہ ہوا۔ اس بیچ پپو سنگھ کو کریدسی لگی۔ وہ اپنا کام دھندھ چھوڑ کر ٹوہ لینے کی غرض سے لال سنگھ کے ٹرک کے پاس پہونچ گیا اور دزدیدہ نظروں سے ٹرک کے اندر جھانکنیکی کوشش کرنے لگا۔ اُس نے جب اندر کا منظر دیکھ لیا تو اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ لالی ہرن کے بچے کو گود میں لے کر ایسا خوش اور مسرور دکھائی دے رہا تھا

جیسے گورمیت نے اپنا پہلا بچہ جن لیا ہو اور اُس کا باپ لالی اُسے پہلی بار گود میں لے کے بیٹھا ہو۔

گورمیت چراغ میں بتی ڈال رہی تھی کہ لالی ہرن کے بچے کو گود میں اُٹھائے چوروں کی طرح دبے پاؤں گھر میں داخل ہوا۔ اچانک گورمیت کی نظر اُس پر پڑی تو وہ حیرت و مسرت سے تقریباً چیختے ہوئے بولی۔ ''ہائے ربا میں مرجاواں۔ یہ توسی کی لے کے آئے ہو؟''

''یہ ہرن دا بچہ میں توڑے واسطے لے آیا ہوں۔ تو کاروچ اکیلی رہندی ہے نا سو تو اس دے نال کھیلا کرنا۔ اسے اپنے ہاتھوں وچ کھلانا پلانا، اسے پیار دلار کرنا۔ اسوچ تیرا ٹیم بھی پاس ہوگا اور اس بے زبان نو جینے دا سہارا بھی مل جائیں گا''

''پر وہ سب تو ٹھیک ہے۔ پہلے مینوں یہ دسو کہ یہ زنانی ہے یا.....؟''

''مینوں کے پتا۔ آپے دیکھ لو نا'' لالی نے شرماتے ہوئے کہا اور پھر بچے کو گورمیت کی گود میں ڈال دیا۔ گورمیت نے پونچھ اُٹھا کر فوراً جنس کا پتا لگا لیا۔ وہ خوشی سے چیخ کر بولی ''او جی یہ تو زنانی ہے۔'' کہہ کر گورمیت نے بچے کو سینے سے لگا لیا اور پھر اُس کے نرم نرم ملائم بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''ہائے کنا پیارا بچہ ہے۔ ہائے ہائے اس کی اکھاں دیکھو جی کنی سونی ہے۔ ایسا نہیں لگدا جیسے اس کی اکھاں وچ کوئی سرمہ پا کے چلا گیا ہو''

''اے گورمیتے تو کنی واری کشمیری گانے وچ چشم آہو، چشم آہو دی تشبیح سنی ہے۔ جب کدی عاشق اپنی معشوق دی اکھاں کی تعریف کردا ہے تو وہ ان اکھاں نو چشم آہو کہکے بلاندہ ہے۔ چشم

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

آہودا مطبل ہرن دی دوسونی سونی، سرمہ والی اکھاں۔ دیکھو تو یہ کس پیار نال تینوں تک رہا ہے"
گورمیت نے ایک بار پھر اس بچے کو سینے سے لگا لیا اور پھر اُس کے سنہری روئیں میں ہاتھ پھیرنے لگی۔

دھیرے دھیرے گورمیت اور لالی اس ہرنی کے بچے کے پیار میں ایسے ڈوب گئے کہ وہ دنیا و مافیہا کو ہی بھول گئے۔ اُنہوں نے اس کا نام "مکھنی" رکھ دیا کیونکہ وہ مکھن کی طرح نرم و ملائم تھی۔ مکھنی بھی بہت جلد اُن سے ہل مل گئی۔ وہ چند لمحے ادھر اُدھر کھیلتی، قلانچیں بھرتی اور پھر جا کر گورمیت کے پہلو میں جا کر بیٹھ جاتی تھی۔ گورمیت اُسے قلانچیں بھرتی دیکھتی تو اُس پر ہزار جان سے واری واری ہو جاتی تھی۔ مکھنی بڑی معصوم اور سندر تھی۔ پتنی ٹاپ کے جنگل کے بیچ سے نکل کر پتا نہیں یہ اُس جھاڑی تک کیسے پہونچ گئی تھی۔ لالی نے عقل کے گھوڑے دوڑا کر یہی اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کی ماں کو کوئی جنگلی جانور کھا گیا ہو اور یہ ماں سے بچھڑ کر بھٹکتے بھٹکتے سڑک کی طرف نکل آئی ہو۔ یہ تو اُس کی قسمت اچھی تھی کہ یہ لالی کی نظر میں آ گئی۔ رات کا وقت ہوتا تو یہ کسی جنگلی کتے کے منہ کا نوالہ بن گئی ہوتی۔

ایک بار یہ خبر گاؤں میں کیا پھیل گئی کہ لالی سنگھ کے گھر میں ہرن کا بچہ پل رہا ہے۔ لوگ باگ ایسے اُمڈ پڑے جیسے یہ ہرن کا بچہ نہ ہو بلکہ کوئی پہونچا ہوا مستملنگ ہو جس کے دیدار کرنے سے اُنکے سارے گناہ دھل جائیں گے۔ لالی کو اُسوقت بڑی کوفت اور جھنجھلاہٹ ہوتی تھی جب پاس پڑوسی منہ اُٹھائے چلے آتے تھے اور پیر زمین پر رکھتے ہی مکھنی کے حسب نسب کے بارے میں اُلٹے سیدھے سوال کرنے لگتے تھے جیسے مکھنی یہاں کی گدی سنبھالنے والی ہو۔ پتا نہیں لوگ ہر بات کی تہہ تلکیوں پہونچنا چاہتے ہیں۔ لالی سنگھ کو لوگوں کا اسطرح بے روک ٹوک گھر میں آنا جانا کھٹک رہا تھا پر وہ اسکا اظہار نہیں کر پا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ خبر گاؤں سے نکل کر قرب و جوار میں پھیل گئی۔ لالی سنگھ کا گھر زیارت گاہ میں تبدیل ہو گیا۔ کبھی کبھی اُس کے جی میں آتا تھا کہ وہ ابھی مکھنی کو گھر سے دفاہ کر دے اس کی وجہ سے اُس کے گھر کا رین چین وسکوں غارت ہو گیا تھا۔ ساتھ میں چائے پانی کا خرچہ بھی بڑھ گیا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے مکھنی دو سال کی ہو گئی۔ وہ اب بھی لالی اور گورمیت سے دور نہیں رہ پا رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ ترنگ میں آ کر ان دونوں کو سر سے ٹھوکے مار نیلگتی تھی۔ لالی تو ہنس ہنس کے مکھنی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کی یہ مار سہہ لیتا تھا البتہ گورمیت بعض اوقات برہم ہو کر مکھنی کو جی بھر کے کوسنے دینے لگتی تھی اور ساتھ ہی اُس پر دو چار ہاتھ بھی جما دیتی تھی۔ اُس کے اس تیکھے ترش برتاو کے باوجود وہ بڑی لا اُبالی پن سے جئے جا رہی تھی اور اُسے کھانے کو وہ ساری چیزیں مل جایا کرتی تھیں جن کی اُسکو ضرورت تھی۔ اس بیچ کشمیر کے حالات اچانک بگڑ گئے۔ آئے دن عام لوگ مرنے کٹنے لگے۔ اقلیتی فرقے میں خوف وہراس پھیل گیا۔ کئی کنبے اپنا گھر بار چھوڑ کر جموں چلے گئے۔ لالی کو بھی اس خون خرابے سے تشویش ہونے لگی، حالانکہ حاجی صمد ڈار نے اُسے اس بات کی ضمانت دی تھی کہ اُسے بلا وجہ کوئی پریشان نہیں کرے گا پھر بھیّا اس کا جی گھبرا رہا تھا۔ اُسنے ساری زندگی بے فکری کے عالم میں گزاری تھی۔ وہ خوف ودہشت میں جینے کا عادی نہ تھا، اسلئے ہر دم اُسے یہ فکر ستانے لگی کہ اگر یہ خون خرابہ اسطرح چلتا رہا تو وہ ایسے ماحول میں کیسے جی پائے گا؟

جس دن اُسی کے محلے کے تین سکھ پریوار راتوں رات اپنا سامان ٹرکوں میں لاد کر چوری چھپے گاؤں چھوڑ کر چلے گئے، اُسے دیکھ کر لالی کی بچی کھچی آس اُمید بھی ٹوٹ گئی۔ اُسے لگا کہ وہ ننگی تلوار کے سایے میں جی رہا ہے۔ ایک رات اُسنے گورمیت کو اپنے پاس بٹھا کر پوچھا۔

''کھیر سنگھ بھی نس گیا۔ پرتھوی سنگھ بھی اپنا پورا ٹبر لے کے چل پیا۔ ہون تو دس اسی کی کریں۔ اتھے رہ کے ڈر مر کے جئیں یا اسی بھی اُس پار جموں چلے جائیں؟''

گورمیت نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

''اپنا کار چھڑ کے جاویں دل تو نہیں منداپر کے کریں۔ تو سی حلات تو دیکھ ہی رہے ہو۔ کل دو نکے نکے بچے بم پھٹن سے مر گئے۔ ہائے ربا یہ اس سورگ نو کی ہو گیا۔ کسیری دی نظر لگ گئی اسے۔ کنے چین آرام نال اسی اتھے رہ رہے تھے۔ ہون اتھے رہنا وبال ہو گیا۔ میری گل من لو جی۔ چھوٹا موٹا سامان ٹرک میں ڈال کے مینوں جموں لے چلو۔ پیٹ بھر روٹی نہ ملے۔ کم سے کم چین نال تو جی لیں گے نا۔''

لالی نے گورمیت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اُسے سہارا دیتے ہوئے کہا۔

''فکر کرنے دی کوئی لوڑ نہیں۔ واہگورو سب ٹھیک کرے گا۔ مینوں بس ایک ہی پریشانی لگی ہے کہ اسی اگر چلے گئے تو مکھنی کا کے ہوئے گا۔ وہ ساڑھے قول چل تو نہیں پائے گی۔ مان لو کہ راستے وچ پیسہ پوسہ کھلا کے اسی مکھنی کو جموں لے گئے تو یہ اُتھے کیسے رہ پائے گی؟ کدی پولیس دی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

نظر وچ آ گئی تو؟ پولیس بھی چھڑو۔ یہ اُدھر دی گرمی کیسے سہہ پائے گی؟''

''میں تو ایک ہی گل جان دی ہوں۔ مکھنی ساری زندگی ساڑھے نال نہیں رہ سکدی۔ میری گل مانو۔ مکھنی نو راتی پاس کے جنگل میں چھڑ کے آجاو۔ یہ بھی چین نال جیپائے گی اور اسی بھی شانتی نال رہ پائیں گے۔ اسے اپنے آپ سے الگ کر کے جنا دکھ تینوں ہوگا اُس سے کہیں زیادہ دکھ تو مینوں ہوگا۔ میں نے تو اسے اپنی اولاد کیطرح پالا ہے پر کے کریں۔ اسے اتھے اے ویں چھڑ کے جائیں گے تو کوئی بھی اسے حلال کر دے گا۔ کیا تو سی چاہو گے کہ یہ کٹ کے مر جائے؟''

مکھنی کے ایسے خوفناک انجام کا تصور کر کے لالی سنگھ کا کلیجہ کانپ اُٹھا۔ اُسنے گورمیت کی طرف تعریفی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

''تیری گل سولہ آنے سچ ہے۔ کہتے ہیں کہ ہرن دا گوشت بڑا لذیذ ہوندا ہے۔ جس مکھنی کو ہم نے بچے کی طرح پال پوس کے وڑا کیا اُسے میں کسی قصائی دی چھری کے واسطے چھڑ کے نہیں جاوں گا۔ میں آج راتی مکھنی کو جنگل میں چھڑ کے آوں گا۔''

گورمیت نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور پھر وہ دونوں بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔

دھندلے کا وقت تھا۔ لالی سنگھ نے پگڑی اُتار کر طاقچے پر رکھ دی اور پھر وہ سر پر پٹکا باندھ کے مکھنی کے پاس چلا گیا۔ پہلے اُس کی گردن سہلائی اور پھر ٹٹکار یمارتے ہوئے وہ اُسے گھر سے باہر لے جانے لگا۔ گورمیت دروازے کی اوٹ میں کھڑی روتی ہوئی آنکھوں سے مکھنی کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ باہر ہو کا عالم طاری تھا۔ لوگ جیسے اپنے اپنے بلوں میں دبک کر بیٹھے ہوئے تھے۔ لالی مکھنی کو ہنکارتے ہوئے پاس کے جنگل تک لے گیا اور پھر اُس کی رسی کھول کر اُسے دو ایک تھپکے مارتے ہوئے آگے دھکیل دیا۔ مکھنی اندھیرے میں ہری ہری گھاس دیکھ کر گھاس کی پتیاں توڑ توڑ کر چبانے لگی۔ لالی اُسے چرتا چھوڑ کر وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ وہ جب گھر پہونچا تو اُس نے دیکھا کہ گورمیت پھپھک پھپھک کر رو رہی تھی۔ لالی جونہی نیچے بیٹھ گیا تو اُس نے روتے ہوئے لالی سے پوچھا۔

''چھڑ آئے میری مکھنی کو؟''

''ہاں چھڑ آیا۔'' لالی نے روہانسا ہو کر سر نہوڑے ایسے جواب دیا جیسے وہ کوئی عظیم گناہ کر کے آیا تھا۔ مکھنی کی جدائی اُس کے دل کو بھی برما رہی تھی پر وہ کیا کرتا۔ مکھنی کیلئے ایسا بے رحم

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

فیصلہ لینا بہت ضروری تھا۔ کبھی کبھی ہم کو اپنے من کو مار کر دوسروں کے بھلے کے لئے ایسے کام بھی کرنے پڑتے ہیں جو ہمارے ضمیر کے منافی ہوتے ہیں۔ لالی نے بھی جو کچھ کیا تھا وہ اپنے دل کا خون کر کے اپنے جذبات کا گلا گھونٹ کر کیا تھا۔

وہ رات اُنہوں نے روتے اور آہیں بھرتے ہوئے گزاری۔ گورمیت تو ایک پل بھی سو نہیں پائی۔ اُس کے احساس کو جیسے مکھنی کے نرم و ملائم بال کانٹے بن کر چبھ رہے تھے۔ اُس کے جذبات کو جیسے اُس کی سرمئی آنکھیں رہ رہ کے برما رہی تھیں۔ اچانک وہ بستر سے اُٹھی اور تیزی سے دروازے کی جانب لپکی۔ جونہی اُس نے دروازہ کھولا اُس کے منہ سے مارے خوشی کے چیخ نکل پڑی۔

''او جی یہ دیکھو کون آیا ہے۔ اوئے اپنی مکھنی لوٹ کے آ گئی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ مکھنی سے لپٹ گئی اور پاگلوں کی طرح اُسے چومنے لگی۔ اتنے میں لالی باہر آ گیا۔ اُسنے جب مکھنی کو دیکھا تو وہ دھک سے رہ گیا۔ وہ گورمیت ہر بگڑتے ہوئے بولا۔

''اوئے یہ اتھے پھر کاہے کو مرنے چلی آئی۔ دفا کر اسے۔'' کہہ کر وہ اُسے گھر سے باہر دھکیلنے لگا۔ اب کے گورمیت اُس پر چڑھ بیٹھی۔

''ہائے ہائے یہ تو سی کی کر رہے ہو۔ کیوں اسے ٹھوڑے مار رہے ہو۔ اوئے یہ ساڑھی مکھنی ہے گلی محلے دی کوئی آوارہ کتیا نہیں۔ چلو اندر چلو۔'' وہ اُسے اندر دھکیلنے لگی۔

لالی اس بار اپنا آپا کھو بیٹھا۔ وہ گورمیت پر بگڑتے ہوئے بولا۔

''تیری مت ماری گئی ہے کیا جو تو اس کر کے اس سورنی پر چھپیاں پا رہی ہے۔ اوئے تو تو مرے گی ہی نال اسے بھی مروا دے گی۔ بھول گئی راتی کے گل ہوئی تھی۔ مکھنیا تھے رہے گی تو آج نہیں تو کل ماری جائے گی۔ اوئے وہ مجید قصاب کب سے اس پر نظریں جمائے بیٹھا ہے۔ تو اس کر کے نکل جائے گی اور وہ مجید قصائی اس کے ٹوٹیٹوٹے کر کے رکھ دے گا۔ تیرے کو پتا ہے۔ ہرن کا جڈا گوشت ہوندا ہے ناوڑ الذیذ ہوندا ہے۔ کیا تو چاہندی ہے کہ یہ قصائی کی چھری سے مر کٹ جائے؟''

اب کے گورمیت کورا یکدم کچی دیوار کی مانند نیچے بیٹھ گئی اور پھر مکھنی کی طرف پیٹھ کر کے بولی۔

''میں اکھیا جی۔ لے کے جاوا سے۔ مینوں اس کی زندگی پیاری ہے۔ اس کی موت نہیں۔''

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اگلے روز لالی نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ مکھنی کو جنگل کے باہر نہیں بلکہ جنگل کے اندر چھوڑ کے آئے گا تاکہ وہ پھر اس جنگل سے باہر نہ نکلنے پائے۔ چنانچہ وہرات کا بڑی بے صبری سے انتظار کرنے لگا۔ مکھنی ان ساری باتوں سے بے خبر گورمیت کے بغل میں بیٹھی جگالی کر رہی تھی۔ لالی رسی ہاتھ میں لے کر کب سے تیار بیٹھا تھا۔ وہ تو بس اندھیرا ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ جب رات کی سیاہی چاروں اور پھیل گئی تو لالی مکھنی کو لے کر گھر سے نکلا اور اندھیرے میں راستہ تلاش کرتا ہوا گرتے پڑتے مکھنی کو لے کر جنگل میں گھسا۔ جنگل کا یہ عالم تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ مکھنی کو ہانکتا ہوا جنگل کے بیچوں بیچ پہونچ گیا۔ چارسو ہو کا عالم طاری تھا۔ سائیں سائیں کرتی ہوائیں اس ڈراونے ماحول کو اور زیادہ ہولناک بنا رہی تھیں۔ وہ اس بات سے بے خبر بڑی بے خوفی سے آگے بڑھتا چلا گیا کہ فوج غیر ملکی دراندازوں کو گھیرنے کے لئے جنگل میں گھات لگا کے بیٹھی ہے۔ اُس پر تو بس ایک ہی دھن سوار تھی۔ وہ مکھنی کو ایسی سرحدوں تک لے کے جانا چاہتا تھا جن کے بیچ رہ کر اُس کی زندگی محفوظ رہے اور جہاں وہ آزادی سے جی سکے۔ جہاں کسی قصاب کی بے رحم چھری اُس کی گردن ناپنے کے لئے بے تاب نہ ہو۔

گورمیت بڑی بے صبری سے لالی کے گھر لوٹنے کا انتظار کر رہی تھی۔ صبح ہوئی وہ نہیں لوٹا۔ گورمیت کو فکر ہونے لگی۔ جب صبح سے دوپہر ہوگئی تو گورمیت کو رکواب کے تشویش ہونے لگی۔ وہ گھر سے نکل کر ادھر اُدھر دوڑی بھاگی۔ اُسنے گاؤں کا چپہ چپہ چھان مارا۔ وہاں نہ ملا تو جنگل کو کھنگالا۔ اُسنے ہر جگہ اُسے تلاش کیا مگر اُسیلالی کیالالی کی گرد تک نہ ملی۔ اب کے دل میں یہ کھٹکا لگا کہ کوئی نہ کوئی انہونی ہوئی ہے۔ وہ جب تھک ہار کے گھر کی طرف واپس لوٹ گئی تبھی دو پولیس والوں کو گھر کیباہر کھڑے دیکھ کر اُس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ دوڑ کر اُنکے پاس چلی گئی اور دھڑکتے دل سے ایک سپاہی کی بانہہ پکڑ کر اُس سے پوچھا۔

"کے قہر ہوگیا جی۔ میرا مرد.....؟"

"تیرا مرد اب رہا نہیں۔ رات کو اُسے فوجیوں نے مغالطے میں دہشت گرد سمجھ کر گولی مار دی۔"

گورمیت کو رایک پل کے لئے سن ہو کر رہ گئی پر دوسرے ہی پل وہ سینے پر دو ہتھڑ مار کر پولیس اسٹیشن کی طرف بے تحاشہ بھاگنے لگی۔ گاؤں والے بھی اُس کیپیچھے بھاگے۔ وہ روتی چلاتی اُس

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کمرے تک پہونچ گئی جہاں لالی کی گولیوں سے چھلنی لاش پڑی تھی۔ وہ لاش پر گر کر بین کرنے لگی۔ اپنی چھاتی پیٹنے لگی۔ اپنے سر کیبال نوچنے لگی۔ گاؤں والے بت بنے کھڑے کھڑے اُسے ولاپ کرتے دیکھ رہے تھے۔

لالی کا داہ سنسکار کرنے کے بعد جب گاؤں والے اُسے گھر پر لے کر پہونچے تو یہ دیکھ کر لوگ دنگ رہ گئے کہ اُس کے رشتہ دار اُس کا سامان ٹرک میں لاد رہے تھے۔ گاوں کی ایک بزرگ خاتون جان دید بھیڑ سے نکل کر اُس کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی اور پھر اُسے سہارا دے کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''اس گاؤں کو چھوڑ کے مت جا گورمیت۔ مت جا۔'' جان دید کی آنکھیں اشک بار تھیں اور ان بھیگی آنکھوں میں ایک التجا تھی، ایک فریاد تھی۔

''اب اتھے رہ کے کیا کروں گی۔ جب بھاڑ ہی کھیت کو کھائے تو رکھوالی کون کرے۔ نا جی میں اب اتھے نا رہوں گی جی۔'' کہکر وہ گاڑی میں سامان لدوانے لگی۔ وہ جونہی ٹرک کی طرف بڑھی تو دفعتاً مکھنی سامنے سے دوڑتی ہوئی چلی آئی اور جا کر گورمیت کے بغل میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ گورمیت ایک پل کے لئے سن ہو کر مکھنی کو دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہ گئی لیکن دوسرے ہی پل وہ اُس کی طرف غصے سے دیکھ کر چلائی۔ ''جنم جلی میرے خصموں نو کھا گئی۔ اب اتھے کیا لینے آئی ہو؟''

مکھنی بے بس اور لاچار نظروں سے گورمیت کی اور دیکھنے لگی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ گورمیت کا کلیجہ پھٹ پڑا اور وہ مکھنی سے لپٹ کر رونے لگی۔ جی کا بوجھ ہلکا کر کے وہ ڈرائیور سے بولی۔ ''پرا جی! سامان تھلے اتار دو۔ ہون میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ ہون میں اتھے ہی مکھنی نال رہوں گی'' کہہ کر وہ ایک بار پھر مکھنی سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

■ ■ ■

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

قصائی کی بکری

جمال قصائی ہمارے علاقے بڈگام کا بڑا ہی بے مروت اور بے رحم قصائی تھا۔ وہ جتنا بد صورت تھا اُتنا ہی سفاک اور موذی تھا وہ۔ پتہ نہیں وہ کس بات کا دل جلا تھا کہ جب دیکھو اُسکے چہرے سے وحشت برستی تھی، ایسا بد مزاج اور سڑیل تھا وہ کہ کسی نے اگر زرا سی بات کہی تو وہ کہنے والے پر اسطرح ٹوٹ پڑتا تھا جیسے مردار خور جانور مردے پر۔ اُسکو چھیڑنا بھڑ کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا۔ شریف شرفا اُسکے سامنے یوں ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے جیسے اُستاد کے آگے شاگرد۔ وہ جس طرح کا بھی گوشت کاٹ کے دے دیتا تھا گراہک کو طوعاً و کراہاً اسے سوغات سمجھ کر قبول کرنا پڑتا تھا۔ ایسا دہشت اور دبدبہ تھا اُس کا کہ کوئی اُسکے سامنے منہ کھولنے کی جرات نہیں کر پاتا تھا۔ لوگ بھی مجبور تھے کیونکہ اس گاوں میں یہ قصائی کی واحد دوکان تھی۔ آج تک کوئی اور قصاب جمال سے براہ راست ٹکر لینے کی ہمت نہیں کر پایا تھا۔ اس کے لئے بہت بڑے دل گردے کی ضرورت تھی جو کسی کے پاس تھا ہی نہیں سو جمال دوسروں کی اسی کمزوری کا فائدہ اُٹھا کر اپنی من مانی چلا رہا تھا۔

جمال کا خاندان چار افراد پر مشتمل تھا۔ ایک اُس کی بیوی زونی جو بالکل اس کے اُلٹ تھی۔ وہ جتنا غلیظ اور بدرو تھا وہ اتنی ہی نیک اور خوبصورت تھی۔ اس کے علاوہ

جمال کی دو بیٹیاں تھیں جنہیں وہ اپنی جان سے بھی زیادہ پیار کرتا تھا۔ گو کہ وہ برسوں سے بیٹے کے لئے ترس رہا تھا پر وہ زونی سے بے انتہا پیار کرتا تھا۔ جب کبھی اُسے

کوئی یہ رائے مشورہ دینے لگتا تھا کہ وہ دوسری شادی کر لے تو وہ اپنا آپا کھو دیتا تھا اور رائے دینے والے کی مٹی پلید کر کے رکھ دیتا تھا۔ اُس کا یہ ماننا تھا کہ آس اولاد اللہ کی منشا اور رضا سے ملتی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہے، بیویاں بدلنے سے نہیں۔ زونی بھی اُسے دیوانگی کی حد تک پیار کرتی تھی البتہ اس بات کا اُسے ملال تھا کہ وہ اپنے شوہر کو ایک بیٹا نہ دے سکی۔

جمال باہر سے جتنا تند و ترش دکھائی دیتا تھا اپنے گھر میں آ کر وہ اتنا ہی شریف اور بھولا بن جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ سانپ ہر جگہہ ٹیڑھا چلتا ہے البتہ اپنی بانبی میں وہ سیدھا جاتا ہے۔ جمال کو دوسروں کو رلانے میں بڑا مزہ آتا تھا جب کہ وہ اپنی بیٹیوں کی آنکھوں میں ایک آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اگر آسمان سے تارے توڑ کر لانے کو کہتیں تو جمال اس سعی لا حاصل کو آزمانے سے گریز نہ کرتا۔ اُس کی دونوں بیٹیاں حالانکہ بڑی کمسن تھیں مگر کم سن ہونے کے باوجود وہ بڑی تیز فہم اور ذہین تھیں۔ بڑی کا نام حسینہ اور چھوٹی کا نام شاذیہ تھا۔ بڑی چوتھی میں اور چھوٹی تیسری میں پڑھتی تھی۔ زونی تو انپڑھ گنوار تھی۔ بس دن رات وہ چولھے چوکھے میں سر کھپاتی رہتی تھی جب کہ بچیاں پڑھنے کے ساتھ ساتھ خالی اوقات میں بھیڑ بکریاں چرانے لے جاتی تھیں یا ماں کا ہاتھ بٹایا کرتی تھیں۔

جمال دوکان سے اچھا خاصا کما لیتا تھا۔ گھر کی گذر بسر اچھے ڈھنگ سے ہوتی تھی۔ چونکہ وہ پیشے سے قصائی تھا اسلئے گھر میں ہر دن گوشت پکتا تھا۔ بچے بھی گوشت کے ایسے شیدائی بن کر رہ گئے تھے کہ بنا گوشت کے انکے حلق کے نیچے سے نوالہ اُترتا ہی نہیں تھا۔ ماں کبھی ڈانٹتی تو جمال برافروختہ ہو جایا کرتا تھا۔ وہ اپنی بچیوں کو ڈانٹنا تو دور آج تک اُسنے کبھی ٹیڑھی آنکھ کر کے بھی نہیں دیکھا تھا اُنہیں۔ وہ تو اُنہیں ہر دم ہنستے اور مسکراتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا۔

جمال کے لئے عید کا تیوہار بڑا معنی رکھتا تھا۔ عید کا تیوہار ہو یا کسی کے یہاں شادی بیاہ، سمجھو جمال کے پو بارہ ہو گئے۔ سارے کے سارے بھیڑ یا بکریاں جمال ہی فراہم کرتا تھا۔ عید کے روز تو کم سے کم آٹھ دس بکرے کٹ جاتے تھے۔ قربانی کے روز تو جمال کے گھر پر گراہکوں کا خوب جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ بولی پہ بولی لگتی تھی

جمال کے تو اس طرح کی تقریبات پر وارے نیارے ہو جایا کرتے تھے۔ جب مقابلے میں کوئی نہ ہو وہاں پر بیچنے والے کی من مرضی چلتی رہتی ہے۔ جمال بھی جس بھاو میں چاہتا تھا جانور بیچ دیا کرتا تھا۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ تھا اسلئے گراہک کو اُسی کے حساب کتاب سے چلنا پڑتا تھا۔

ایک دن جمال کے کانوں میں بھنک پڑ گئی کہ پاس کے گاوں پچھ کوٹ کا ایک قصاب یہاں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

پر دوکان کھولنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یہ خبر سن کر جمال کے کان کی لوئیں سرخ ہو گئیں۔ جی میں آیا کہ دیکھیں یہ شیر کی مانگ میں ہاتھ ڈالنے کا حوصلہ کون کر بیٹھا ہے۔ پتہ چلا کہ ایک لونڈا ہے جو جمال کے ساتھ دو دو ہاتھ آزمانا چاہتا ہے۔ جمال کا خون کھول اُٹھا۔ اُس نے اُسی شام بیچھ کوٹ جانے والی بس پکڑ لی اور سیدھے دندناتے ہوئے اُس لونڈے کے گھر میں جا پہونچا۔ لونڈے کا نام رفیق تھا اور اُس کا باپ رحمان قصائی جمال کو اچھی طرح جانتا تھا اسلئے جب اُس نے غصے سے بھرے ہوئے جمال کو اندر آتے دیکھا تو اُس کا ماتھا ٹھنکا۔ سوچا ضرور کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔ اُسنے بڑی حلیمی کے ساتھ جمال سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے جمال بھائی۔ بڑے غصے میں دکھائی دے رہے ہو۔؟''

''میں یہ کیا سن رہا ہوں کہ تمہارا لونڈا میرا دھندہ ٹھپ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟ رحمان کاکا تم تو جانتے ہو کہ میں نے آج تک کسی سے ہار نہیں مانی ہے۔ مجھ سے ٹکرانے کے لئے لوہے کا جگر چاہیے۔ تمہارے لونڈے کے ابھی دودھ کے دانت نہیں ٹوٹے وہ مجھ سے کیا مقابلہ کر پائے گا۔ سمجھاو اپنی اس ناخلف اولاد کو کہ وہ شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کی حماقت نہ کرے۔ تم تو یہ بات بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ شیر کو چھیڑنا کتنا خطرناک اور جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔''

لونڈا دروازے کی اوٹ میں کھڑا سن رہا تھا۔ گرم خون تھا۔ وہ کہاں دبنے ڈرنے والا تھا۔ وہ مشتعل ہو کر نیچے آ گیا اور جمال کو للکارتے ہوئے بولا۔

''کاروبار میں کسی کی دادا گیری نہیں چلتی ہے جمال کاکا۔ اب تک تم لوگوں کی مجبوری کا فائدہ اُٹھا کر اُنہیں ڈراتے دھمکاتے رہے۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔ اگر تجھ میں اتنا دم خم ہے تو میرے دوکان کھولنے سے تم اسطرح بوکھلا کیوں اُٹھے۔ ہمت ہے تو مقابلہ کرو نا۔ ایک مہینے میں تمہیں دوکان بڑھانے پر مجبور نہ کیا تو میرا نام بھی رفیق گنائی نہیں'' سیر کو سوا سیر کیا مل گیا کہ جمال کے تیور ڈھیلے پڑ گئے۔ تاہم وہ اپنے آپ کو سمیٹ کر اُسے آنکھیں دکھاتے ہوئے بولا۔

''کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ۔ اپنی حثیت دیکھ۔ اپنی عمر دیکھ۔ میں نے یہ چونڈا دھوپ میں بیٹھ کر سفید نہیں کیا ہے۔ زمانے کے نرم و گرم کو سہا ہے۔ تم ابھی ابھی خول سے باہر آ گئے ہو اور مجھے کاروبار کی باریکیاں سمجھانے لگے ہو۔ ارے تجھ جیسوں کو تو میں اِزار میں ڈال کر پہن لیتا ہوں۔ اب بھی سمجھا رہا ہوں۔ مجھ سے ٹکرانے کی کوشش مت کر۔ کہیں کے نہیں رہو گے۔ میں وہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

سانپ ہوں جسکا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا۔ بہت کمینہ آدمی ہوں میں۔'' جمال کی مونچھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ وہ بک جھک کے نکل گیا۔ اُس کے جاتے ہی رفیق کا بوڑھا باپ رحمان قصائی کچی دیوار کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ اپنے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے بولا۔

''دیکھ بیٹا جب پانی میں رہنا ہو تو مگر مچھ سے بیر نہیں رکھا جاتا۔ یہ جو جمال ہے نا اسے میں برسوں سے جانتا ہوں۔ بڑا ہی کمینہ اور کینہ پرور آدمی ہے۔ یہ تمہاری طرح جوان نہ سہی پر آگ اور بیری کو کم نہ سمجھیو۔ یہ کل کو تمہیں کسی ایسی آفت اُفتاد میں ڈال دے گا جہاں سے تم نکل ہی نہیں پاؤ گے۔ کیوں اس موذی سے دشمنی مول کر تم اپنے حق میں کانٹے بونے کی کوشش کر رہے ہو۔؟''

اب کے رفیق بپھر کر بولا۔

''ابا آگ کا جلا آگ سے ہی اچھا ہوتا ہے۔ اس کی ان گیدڑ بھبکیوں سے ڈرو مت۔ وہ اپنے آپ کو بڑا تیس مار خان اسلئے سمجھتا ہے کیونکہ آج تک اُس کا واسطہ کسی زور آور سے پڑا نہیں۔ اونٹ جب تک پہاڑ کے نیچے نہیں آجاتا اپنے سے اونچا کسی کو نہیں جانتا۔ قسم خدا کی، ایک بار اسے پہاڑ کے نیچے آنے تو دو پھر دیکھو میں اس کی کیا گت بنا دوں گا۔ میں نے اس کے سارے کس بل نہ نکال دئے تو میں بھی تمہاری اولاد نہیں۔ اب تک اس نے اپنے خریداروں کو بہت ستایا ہے۔ بہت رلایا ہے۔ اب میں اسے ستاؤں گا۔ اس کی راتوں کی نیند اور دن کا قرار لوٹ کے لے جاؤں گا میں۔ وہ کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو''

''بند کر اپنی یہ بکواس۔'' رحمان برافروختہ ہو کے بولا۔ ''تمہارے سر پر سنیچر سوار ہو گیا ہے۔ اسلئے ایسی سر پھری باتیں کر رہے ہو۔ ارے مرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو کسی ندی نالے میں کود کر جان کیوں نہیں دیتے۔ کیوں جمال کے ہاتھوں بے موت مرنا چاہتے ہو۔ اپنا نہ سہی کچھ ہمارا تو خیال کرو۔ سنا نہیں کیا کہہ کے گیا وہ؟''

''ابا جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں ہیں۔ اگر وہ اتنا بڑا افلاطون ہے تو اُسے مجھ سے ڈرنے کی قطعی ضرورت نہیں۔ اُسے میدان میں اُتر کر میرا مقابلہ کرنا چاہیے۔''

''میں کوئی بھی تاویل سننا نہیں چاہتا۔ تم سے جو کہا گیا ہے وہ کرو۔ اگر تم نے میرے فیصلے کے خلاف جانے کی کوشش کی تو یاد رکھنا تم میرا مرا ہوا منہ دیکھو گے'' کہہ کر رحمان برہمی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ رفیق بس غصے سے ہاتھ مل کر رہ گیا۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

باپ کے ڈرانے دھمکانے کے باوجود رفیق قصائی نے اپنا ارادہ نہیں بدلا۔ چنانچہ اُس نے جمال کی دوکان سے دو ہاتھ دور دوکان کھول دی۔ جمال اُس کی اس دیدہ دلیری سے تلملا کر رہ گیا۔ رفیق کے مقابلے پر آنے کے سبب جمال بڑا ہی خونخوار اور سڑیل بن گیا۔ وہ بات بات پر گراہکوں کے ساتھ تھکا فضیحتی پر اُتر آتا تھا

کبھی کبھی وہ اس قدر آپا کھو دیتا تھا کہ چھری لے کر گراہک کو مارنے کو دوڑتا تھا۔ چنانچہ اُس کے اس رویے سے گراہک ایک ایک کر کے اُس سے ٹوٹنے لگے۔ ایک دن ایسا بھی آیا جب اُس کی دوکان پر اُلو بولنے لگے۔ جمال کا خون کھولتا جا رہا تھا۔ وہ رفیق کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتا تھا۔ وہ بس موقع کی تاک میں تھا۔ وہ اپنے اس نوخیز کاروباری حریف کو اس طرح فنا کرنا چاہتا تھا کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

رفیق کم عمر ضرور تھا البتہ وہ کاروبار کے سبھی داؤ پیچ اچھی طرح سے جانتا تھا۔ اُس نے جمال کو کوئی ایسا موقع نہ دیا جو وہ اُس پر حاوی ہو سکے۔ وہ یہ باتا چھی طرح سے جانتا تھا کہ وہ اُس کی جان کے درپے ہے اس لئے وہ ہر معاملے میں پھونک پھونک کے قدم رکھتا تھا۔ بھیڑ یا بکری کاٹنے سے پہلے وہ اس بات کی پوری طرح تصدیق کر لیتا تھا کہ جانور کسی بیماری میں مبتلا تو نہیں ہے۔ اطمینان ہونے کے بعد ہی وہ جانور کو ذبح کر دیتا تھا۔ گراہک اُس کی خوش خلقی اور طور طریقے سے بہت خوش تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو جمال سے شاکی تھے۔ وہ آکر رفیق کا حوصلہ بڑھاتے تھے۔ اُسے کاروبار کو بڑھانے کے کارآمد نسخے بتا کر جاتے تھے۔ جمال رفیق کی دوکان پر گراہکوں کے ٹھٹ لگتے دیکھ کر اپنی چھاتی پیٹ کر رہ جاتا تھا۔ وہ رفیق کو پانی پی پی کر کوستا رہتا تھا۔ وہ بھی پتا نہیں کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ جمال کے کوسنوں اور بددعاؤں کا اُس پر کوئی منفی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔ جمال اُسے یوں ترقی کرتے دیکھ کر دن رات انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔

اس بیچ بقر عید قریب آنے لگی۔ رفیق گنائی اس بار یہ طے کر کے بیٹھا تھا کہ وہ اس عید کے تیوہار پر جمال کو اسطرح پچھاڑ کے رکھ دے گا کہ یہ دھندہ چھوڑ کر کوئی اور دھندہ شروع کرے پر کرنا خدا کا یہ ہوا کہ عید سے دو دن پہلے ایسی شدید برفباری ہوئی جس سے جموں سرینگر قومی شاہراہ پر ٹریفک کی نقل وحمل ایکدم رک گئی۔

رفیق گنائی نے جو مال راجستھان سے منگایا تھا وہ ٹرک بٹوت میں ہی رک گیا۔ اس خبر سے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

رفیق کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ یہ سوچ کر اُس کا دل ڈوبا جا رہا تھا کہ اگر راستہ وقت پر نہ کھلا تو وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ اُس کا سارا پیسہ ڈوب جائے گا اور وہ مقروض و محتاج بن کے رہ جائے گا۔

جمال کو رفیق کے ارادوں کی بھنک پہلے سے ہی مل چکی تھی اس لئے وہ خدا سے یہی دعا کر رہا تھا کہ رفیق کے ارادوں پر پانی پھر جائے۔ اُس کی دوکان کو لوکیلگ جائیں۔ جب اُسے یہ خوش کن خبر مل گئی کہ رفیق کا ٹرک راستے میں ہی پھنس گیا ہے تو وہ بلیوں اُچھل پڑا۔ اُس نے فوراً جا کر سجدہ شکر بجالایا وہ اس خبر سے پھولے نہیں سما رہا تھا کہ اُس کے حریف کے ارادوں پر بجلی گری ہے۔ وہ جھپ سے دوکان بند کر کے مال کی تلاش میں نکلا۔ وہ آس پاس کے گاؤں میں گھوم کر کچھ بھیڑ بکریاں خریدنا چاہتا تھا تا کہ عید کے موقع پر خریداروں کو گوشت کی قلت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

صبح جب اُس کی بیوی جانوروں کو پانی پلانے گئی تو اُس نے ایک بکری کو ترحم بھری نظروں سے اپنی اور گھورتے ہوئے دیکھا۔ وہ جب اُس بکری کے قریب چلی گئی تو یہ دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی کہ وہ گابھن تھی۔ پتا نہیں زونی کے ہاتھ بے ساختہ اُس کی پیٹ کی طرف کیوں اُٹھے۔ وہ بڑے پیار سے اُس کا پیٹ سہلانے لگی۔ بکری کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ زونی کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے اُس سے کہہ رہی ہو کہ میں ماں بننے والی ہوں اسلئے مجھے ذبح مت کرنا۔ زونی بذاتِ خود ایک ماں تھی۔ اس لئے وہ ایک ماں کی فریاد بڑی آسانی سے سمجھ سکتی تھی۔ اُس نے بکری کے سر پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرا اور پھر وہ باندی خانے سے باہر چلی گئی۔

عید کا چاند نظر کیا آ گیا گاؤں کے بیشتر لوگ رفیق کی دوکان کی طرف گوشت لینے کے لئے دوڑے مگر یہ دیکھ کر وہ دھک سے رہ گئے کہ رفیق کی دوکان بند پڑی تھی جب کہ جمال کی دوکان کھلی تھی اور دوکان کے اندر کئی کٹے ہوئے بھیڑ لٹک رہے تھے۔ بادل نخواستہ گراہکوں کو گھوم پھر کے جمال کی دوکان کا ہی سجدہ کرنا پڑا۔ یہ دیکھ کر وہ دنگ رہ جاتے تھے کہ جمال جیسے سڑیل آدمی کا رویہ ایکدم بدلا ہوا تھا۔ وہ بڑی حلیمی اور خوش خلقی سے اپنے گراہکوں کے ساتھ پیش آ رہا تھا۔ وہ جس طرح کے گوشت کی فرمائش کرتے تھے وہ ویسا ہی گوشت اُنہیں کاٹ کر دے دیتا تھا۔ شام ہوتے ہوتے تین بھیڑ اور چار بکرے صاف ہوئے تھے جب کی خریداروں کی تعداد گھٹنے کی بجائے بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ وہ گھر کی طرف بھاگا اور گھر میں بندھے دو بھیڑ اور گابھن بکری کو

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بھی دوکان کی طرف لے جانے لگا کہ اچانک گابھن بکری زور زور سے ممیانے لگی۔ زونی کچن میں بیٹھی کھانا پکا رہی تھی۔ اُس نے جب بکری کے ممیانے کی آواز سنی تو وہ دوڑ کر کچن سے باہر آ گئی۔ یہ دیکھ کر وہ حیران و ششدر ہو کے رہ گئی کہ جمال دو بھیڑوں کے ساتھ حاملہ بکری کو بھی ذبح کرنے کے لئے لے کے جا رہا تھا۔ اُس سے رہا نہ گیا۔ وہ اُسے روکتے ہوئے بولی۔

''اسے نہ لے جاو جمال۔ اسے نہ لے جاو۔ یہ ماں بننے والی ہے۔''

''ماں بنے گی تو اپنا کون سا بھلا ہونے والا ہے۔ آج کٹے گی تو اپنی ساکھ بنی رہے گی اور وہ لونڈا ہمیشہ کے لئے صاف ہو جائے گا۔ ویسے بھی اس کی قسمت میں کٹنا لکھا ہے۔

چاہے آج کٹے یا کل کٹے۔ یہ قصائی کے چھرے سے کب تک بچ پائے گی۔''

''تم کچھ بھی کہو میں اسے تمہارے ہاتھوں ذبح ہونے نہیں دوں گی'' وہ جمال کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ جمال جھنجھلا اُٹھا۔ اُس نے زونی کو ایکطرف دھکا دیکر ہٹا لیا۔ جب تک زونی سنبھل کر اُٹھتی وہ روتی ممیاتی بکری کو گھسیٹے ہوئے لے گیا۔ زونی کو لگا جیسے جمال بکری کو نہیں بلکہ اُسے ذبح کرنے لے گیا ہو۔ وہ اپنے آنسو روک نہیں پائی اور گاؤ خانے کے دروازے پر بیٹھ کر وہ ایک بچے کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔

کشمیر میں بکریوں کا گوشت لوگ کھانا پسند نہیں کرتے۔ اس کے ساتھ یہ روایت جڑی ہوئی ہے کہ بکری کے گوشت کو چاہے کتنا بھی پکاو یہ گھلتا ہی نہیں۔ دومیہ کہ بکری کے معاملے میں گراہک کو ہمیشہ یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں بکری حمل سے نہ ہو۔ حاملہ بکری کو ذبح کرنا غیر قانونی ہی نہیں بلکہ غیر اخلاقی فعل گردانا جاتا ہے۔

چنانچہ غریب سے غریب آدمی بھی بکری کا گوشت لینے سے احتراز کرتا ہے جب کہ قصاب بکریوں کا گوشت بیچنے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں کیونکہ بکریوں کے گوشت میں منافع دوگنا ہوتا ہے۔ اب اس کا آسان طریقہ قصائیوں نے یہ نکالا ہے کہ وہ بھیڑ کے گوشت کے ساتھ ساتھ بکری کا گوشت اس طرح ملا دیتے ہیں کہ گراہک کیا فرشتوں کو بھی خبر نہیں لگ پاتی ہے کہ بکری کا گوشت کونسا ہے اور بھیڑ کا کونسا۔

بازار میں گوشت کے لئے جس طرح آپا دھاپی مچی ہوئی تھی اُس کے پیش نظر جمال کے لئے یہ سنہرا موقع تھا کہ وہ بکری کو آسانی سے بیچ سکتا تھا۔ اس لئے اُس نے زونی کی پرواہ کئے بنا دو

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بھیڑوں کے ساتھ بکری کو بھی ذبح خانے کی طرف دھکیلا۔ بکری اب تک روئے جا رہی تھی اور جمال جیسا بے درد قصائی پرائی پیڑ کیا سمجھ پاتا۔ وہ تو بس رفیق گنائی کو نیچا دکھانے کی دھن میں ایسا پاگل ہو چکا تھا کہ وہ نیک و بد کے بارے میں سوچنے کے لئے تیار ہی نہ تھا۔

وہ رات زونی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں رو رو کر گذار دی۔ پہلی بار اُسے احساس ہوا کہ وہ ایک ایسے بے رحم انسان کے پلے بندھی ہوئی ہے جس کے لئے نہ جذبات کی کوئی قدر تھی نہ احساسات کوئی معنی رکھتے تھے۔ وہ تو ایک بے رحم قصائی تھا جو بس چھرا چلانا جانتا تھا۔ چاہے وہ کسی کی گردن ہو یا کسی کا دل۔ کسی کی کوکھ ہو یا کسی کی ممتا اُس کے لئے تمام تر جزئیات کاروباری نوعیت کے تھے۔

ہر طرف عید کی دھوم تھی البتہ زونی کے لئے خوشی کا یہ تیوہار جیسے رنج و غم کی سوغات لے کر آ گیا تھا۔ اُس گابھن بکری کے ممیانے کی آواز اب تک آسیب کی طرح اُسے اپنا پیچھا کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ پہلی بار اُسے اپنی کمتری کا احساس ہونے لگا۔ وہ سوچنے لگی کہ عورت کتنی بے بس اور مظلوم ہوتی ہے۔ مرد چاہے بیمار ہو، مریل ہو، ناتواں ہو۔ ٹنڈا ہو، لنگڑا ہو، لولا ہو، اندھا ہو، کانا ہو عورت سے ہمیشہ اپنے آپ کو مظبوط و برتر سمجھتا ہے۔ زونی بھی اسی سماج کی ایک ایسی ہی کمزور عورت تھی جس پر اُس کا مرد ہمیشہ حاوی رہا۔ اُس کی تو نہ ہی اپنی کوئی شخصیت تھی نہ اپنا کوئی وجود۔ ہر عورت کی طرح وہ بھی مرد کی چھایا بن کر جی رہی تھی۔ اُس کا شوہر جو بھی فیصلہ لیتا تھا اُسے اُس فیصلے کے ساتھ صاد کرنا پڑتا تھا۔ چاہے وہ فیصلہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ اُسمیں اتنا باک نہ ہوتا تھا کہ وہ مرد کے فیصلے کو چیلنج کرے۔

زونی بھی اُسی قبیل کی عورت تھی۔ وفا شعار۔ جان نثار اور شوہر پرست۔ دن بھر وہ بکری کے سوگ میں بھوکے پیاسے بیٹھی رہی۔ جمال فجر کی نماز سے پہلے گھر لوٹا۔ اُسنے جونہی گھر میں قدم رکھا تو پہلی بار زونی نے اپنے غصے اور بیزاری کا مظاہرہ کیا۔ وہ شوہر کی صورت دیکھ کر ایک زخمی شیرنی کی طرح بپھرائے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی اور جمال ایک پل کے لئے بس دیکھتا رہ گیا۔ زونی کی اس بے ادبی سے جمال کا خون کھول اُٹھا۔ وہ جلبلاتے ہوئے اُس کے پیچھے ہو لیا اور باہر جا کر اُسے دھر لیا۔ اُسنے اُس سے کچھ کہا نہیں۔ بس کھا جانے والی نظروں سے اُسے گھورا اور پھر وہ فجر کی نماز ادا کرنے پاس کی مسجد میں چلا گیا۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

زونی بہت دیر تک برامدے میں کھڑی اپنی بے بسی اور بدنصیبی کو یاد کر کے آٹھ آٹھ آنسو بہاتی رہی۔ وہ اپنے ہی غم میں ڈوبی تھی کہ اچانک اُسے بکری کے ممیانے کی آواز سنائی دی۔ آواز سن کر اُس کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ سرعت سے اُٹھی۔ پہلے دائیں بائیں دیکھا اور پھر دوڑ کر وہ باندی خانے میں گئی اور بے تابی سے گاؤ خانے کا دروازہ کھولا۔ وہاں بکری تھان سے بندھی تھی۔ بکری کو دیکھ کر پہلے وہ ٹھٹھکی اور پھر اُس کی حیرت خوشی میں بدل گئی۔ وہ بے تحاشہ بکری کی طرف لپکی اور اُس سے لپٹ کر بے ساختہ اُس سے پیار کرنے لگی۔ مارے خوشی کے اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور وہ بہت دیر تک بکری سے لپٹ کر روتی رہی۔

جمال فجر کی نماز ادا کر کے جب گھر لوٹا تو اُس نے گاؤ خانے کا دروازہ کھلا پایا۔ وہ جونہی دروازے کے قریب پہونچا تو اُس کی نظر زونی پر پڑی۔ اچانک زونی نے پلٹ کر جو دیکھا تو وہ مارے شرم کے جمال سے آنکھیں نہ ملا پائی۔ وہ نظریں جھکا کر بیٹھ گئی اور اُس کی آنکھوں سے آنسوں کی دھارا پھوٹ پڑی تبھی جمال نے اُسے آواز دی۔ وہ سرعت سے اُٹھی اور بے تحاشہ جمال کی اور دوڑی اور جا کر اُس سے لپٹ گئی۔ جمال اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''ہر انسان کے اندر ایک اور انسان چھپا ہوتا ہے جو اُسے اچھے اور برے کی تمیز کرنا سکھاتا ہے۔ کوئی بھی آدمی فطرت سے قصائی نہیں ہوتا ہے۔ یہ معاشی مجبوریاں یا سماجی ناانصافیاں ہوتی ہیں جو ایک رحمدل انسان کو سفاک، موذی اور بے رحم بننے پر مجبور کرتا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ میں پیشے سے ایک قصاب ہوں۔ گوشت بیچنا میرا دھندہ ہے مگر میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ انسان کے گوشت اور جانور کے گوشت میں کتنی تفاوت ہوتی ہے۔ دھندہ چاہے کوئی بھی ہو ہر دھندے کے اپنے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ میں نے بھی اپنے پیشے کے کچھ اصول بنا رکھے ہیں۔ میرے چھرے کی دھار کتنی بھی تیز کیوں نہ ہو ممتا کا پاس ہے اُسے۔''

زونی نے شدت جذبات سے جمال کے ہاتھوں کو چوما اور پھر اُس سے چمٹ گئی۔ غیر ارادی طور پر جمال کی نگاہ بکری کی طرف اُٹھی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران و ششدر ہو کے رہ گیا کہ بکری اشک بار آنکھوں سے ان دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

■ ■ ■

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بازی گر

غلام دین کو کون نہیں جانتا تھا۔ کشمیر کا بچہ بچہ اُس کے نام سے واقف تھا۔ شہر کے گلی کوچوں میں ہی نہیں بلکہ قریہ قریہ اُسی کے چرچے ہوا کرتے تھے کیونکہ وہ شہر سری نگر کا ایک بہت بڑا شعبدہ باز تھا۔ وہ جہاں بھی کھڑا ہو کے اپنی جادوئی پٹاری کھول دیتا تھا دیکھتے ہی دیکھتے تماش بینوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جایا کرتے تھے۔ گلے میں ایک پھنپھناتا ہوا سانپ ڈالے جب وہ مجمع کے بیچوں بیچ آ کے کھڑا ہو جاتا تھا تو لوگ اُس کی ہر ادا پر تالی بجانے لگتے تھے یا اُس کے کراماتی کھیل دیکھ کر دانتوں تلے اُنگلی دبا کر رہ جاتے تھے۔ وہ عام لوگوں کے لئے ایک معمہ بنا ہوا تھا۔ جس طرح کے وہ کھیل تماشے دکھایا کرتا تھا لوگ سمجھ ہی نہیں پا رہے تھے کہ اسے جادو کہیں یا کوئی کرامات۔ وہ کسی بھی لونڈے لپاڑے کو زمین پر لٹا دیتا تھا اور پھر اُس کے اوپر کالی چادر ڈال کر اُس سے بھیڑ میں کھڑے لوگوں کے حال چال کے بارے میں سوال کرتا تھا۔ لونڈا تڑ پڑ ایک ہی سانس میں پوچھے گئے آدمی کا حال احوال بتا دیتا تھا۔ یہ کرامات دیکھ کر تماش بین انگشت بدنداں ہو کر رہ جاتے تھے۔

لوگوں نے اُس کے بارے میں طرح طرح کی اٹکلیں لگا کے رکھی تھیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ علم غیب کا ماہر ہے۔ کچھ لوگ اُسے بہت بڑا جادوگر مانتے تھے۔ کچھ لوگوں کی یہ رائے تھی کہ وہ اپنے اندر روحانی طاقت رکھتا ہے نہیں تو ایسا کیسے ممکن ہے کہ ایک انجان لڑکا کسی اجنبی کا آگا پیچھا اس طرح بیان کرے جیسے وہ اس کے اندر سمایا ہوا ہو۔ الغرض وہ جو بھی تھا جیسا بھی تھا سب کا پیارا اور دلارا تھا۔ وہ جدھر سے بھی گزرتا تھا لوگ اُسے سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ عورتیں اُس کی کچھ زیادہ والہِ اور قدر دان تھیں۔ آئے دن وہ اُس کی چوکھٹ پر حاضری دینے پہونچ جایا کرتی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

تھیں۔ کسی کا مسلہ یہ کہ گود ہری نہیں ہو پا رہی ہے۔ کسی کا شوہر اُس کے قابو میں نہیں آ رہا ہے۔ کسی پر بھوت پریت کا سایہ پڑ گیا ہے۔ غلاما کسی کو بھی مایوس نہیں کرتا تھا۔ کسی کو گنڈا تعویذ دیا۔ کسی کو دم کر کے پانی پلا دیا۔ کچھ لوگوں کی مشکلیں آسان ہو جاتی تھیں اور کچھ کی نہیں پر جس کی نہیں ہوتی تھی وہ بھی غلاما سے شاکی نہیں رہتا تھا بلکہ اس آس پر بیٹھا رہتا تھا کہ آج نہیں تو کل اُس کی بھی خیر ہوگی۔ انسان ہمیشہ امید فردا پر جیتا آ رہا ہے۔ وہ مرتے دم تک اُمید کا دامن نہیں چھوڑتا۔ یہی حال ان لوگوں کا بھی تھا۔

دوسروں کے درد کا درماں کرنے والا خود کس درماندگی سے گزر رہا تھا، اس کا علم بہت کم لوگوں کو تھا۔ بچپن سے لے کر جوانی تک اس نے سوائے دکھ درد اور افلاس کے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ گھر کی حالت ایسی تھی کہ چولھے آگ گھڑے پانی نہ تھا۔ اس کا باپ جمال دین پیشے سے حمال تھا۔ لوگوں کا بوجھ ڈھو ڈھو کے وہ چار پیسے کما لیتا تھا۔ کام بھی ایسا تھا کہ ملی تو روزی نہیں تو روزہ۔ بس ایک ہی کام اُس نے عقل و دانائی کا کیا تھا۔ گھر میں بچوں کی فوج نہیں کھڑی کی تھی۔ بس ایک ہی آس اولاد تھی جو بڑی مشکل سے پل رہی تھی۔ غلاما ماں باپ کا لاڈلا تھا مگر ماں کے چاؤ چوچلے کے باوجود وہ کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے ترستا رہتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اُس کی ماں کا کلیجہ کٹ کٹ کے گرتا تھا۔ تن کو کپڑا نہ پیٹ کو روٹی ہونے کے باوجود غلاما اس بات سے خوش تھا کہ اُسے پیار کرنے کے لئے اُس کی ماں اُس کے ساتھ ہے۔

ایک دن غلاما کی خوشیوں کو کسی کی نظر لگ گئی۔ اُس کا باپ گھر آ رہا تھا کہ راستے میں ایک تیز رفتار گاڑی کی زد میں آ گیا۔ ٹرک والا تو فرار ہو گیا اور چھوڑ گیا سڑک پر جمال دین کی کٹی پھٹی لاش۔ لاش کی صورت اس حد تک مسخ ہو چکی تھی کہ کوئی بھی اس کٹی پھٹی لاش کی طرف دیکھنے کا تاب نہ لا پا رہا تھا۔ پولیس آ گئی اور اس لاش کو اُٹھا کر لے گئی۔ پوسٹ مارٹم کے بعد چند محلے والوں نے لاش حاصل کر کے اسے مقامی قبرستان میں دفن کر دیا۔ غلاما تب آٹھ سال کا تھا۔ اُس نے ماں کو سیاپا کرتے

ہوئے دیکھا تو وہ بھی زار زار رونے لگا۔ اس صدمے نے اُسے کمہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ یہ جان لیوا حادثہ سچ مچ اُس کی جان لے لے اُس کی ماں نے اپنے آنسو پونچھ کر اُس کی دلجوئی کی۔ ماں کی آغوش میں رہ کر اُسے ایک نئی زندگی ملی اور وہ بہت جلد باپ کی جدائی کا غم بھول

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

گیا۔

ابھی وہ اس صدمے سے سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک اور آفت نے دستک دی۔ اس بار ماں دغا دے گئی۔ موت سے قبل وہ اچھی بھلی دکھائی دے رہی تھی۔

رات کا کھانا کھا کے جب وہ برتن سمیٹنے لگی تو اچانک سینے میں شدید درد اُٹھا اور سارا جسم پسینے سے تر بتر ہو گیا اور بیٹھے بیٹھے سانس پھولنے لگی۔ جب تک وہ کچھ سمجھ پاتا اُس کی سانسیں اُکھڑنے لگیں اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے ملک عدم سدھار گئی۔ ایک بار پھر غلاما پر دکھوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ ماں کے بچھڑ جانے کا غم باپ کے بچھڑنے کے غم سے کہیں زیادہ شدید اور جاں گسل تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اب کس کے سہارے جیئے۔ وہ تو بھری دنیا میں یکہ وتنہا ہو کر رہ گیا تھا۔

اُس کے پڑوس میں ایک پنڈتانی رہا کرتی تھی، نام تھا تارا۔ وہ بھی نصیبوں جلی تھی۔ بھری جوانی میں اُس کا شوہر اُسے داغ مفارقت دے کر چلا گیا تھا اور اُس کی گود میں ایک چھ ماسی بچی چھوڑ گیا تھا جو اُس کے پاؤں کی زنجیر بن کر رہ گئی تھی۔ ایک بیوہ کے لئے ہندو سماج میں نہ کوئی عزت ہے نہ آزادی اور نہ ہی کوئی تحفظ۔ تارا بڑی خوبصورت اور نازک اندام عورت تھی۔ مرد کا سایہ سر سے کیا اُٹھ گیا تھا کہ شہوت پرست مرد اُس دکھیاری کو گرسنہ نگاہوں سے دیکھ کر اپنی آنکھیں سینکنے لگے تھے جسے دیکھو اُسی کی آنکھیں للچائی ہوئی پڑی ہیں۔ وہ جیسے ان بھوکی نگاہوں سے اُسے نوچ نوچ کر کھا جانا چاہتے تھے۔ تارا اپنے سماج کی بندشوں سے واقف تھی اسلئے وہ جینا نہیں چاہتی تھی پر وہ اس ننھے بندھن سے کیسے چھوٹ پاتی جس میں اُس کا مرحوم شوہر اُسے باندھ کے چلا گیا تھا۔ طوعاً و کرہاً اُسے جینا ہی پڑا۔ محض اپنی معصوم بچی کی خاطر جس کا نام اُس نے سرلا رکھا تھا۔ کہتے ہیں کہ گھائل کی حالت گھائل ہی جانے۔ غلاما کی حالت دیکھ کر تارا کا کلیجہ پھٹا جانے لگا۔ آخر اس معصوم بچے کا کیا ہوگا یہ سوچ کے وہ پریشان ہوئے جا رہی تھی۔ وہ غلاما کے چاچا کو جانتی تھی جو دوسرے محلے میں اپنے پریوار کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک روز وہ سویرے سویرے اُس کے گھر پہونچ گئی اور اُسے غلاما کی زندگی کا واسطہ دیا۔ یہ دیکھ کر تارا اپنا من مسوس کر رہ گئی کہ اس کا چاچا اپنے بھتیجے کا بوجھ اُٹھانے کے لئے تیار نہ تھا۔ عذر یہ پیش کیا کہ وہ پہلے سے ہی اپنے آٹھ بچوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے اسلئے وہ نویں کو گھر میں آسرا نہیں دے سکتا۔ تارا اُس کی اس دلیل

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

سے برافروختہ ہو اُٹھی اور وہ اُسے سخت سست سنا کر وہاں سے اُٹھ کر چلی آئی اور سیدھے غلاما کے پاس چلی گئی جو گھر کے باہر بیٹھا پھوٹ پھوٹ کے رو رہا تھا۔ تارا نے اُسے یوں ٹسر ٹسر کے روتے دیکھا تو اُس کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ وہ اُس کے پہلو میں بیٹھ گئی اور پھر اُس کا سر سہلاتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ''ماں یاد آ رہی ہے کیا؟''

''ہاں ماں بہت یاد آ رہی ہے۔'' وہ روتے روتے بولا۔

تارا نے پیار سے اُس کا سر سہلایا اور پھر اُس کے آنسو پونچھ کر بولی۔ ''میں تمہاری ماں کو واپس بلا تو نہیں سکتی البتہ اُس کی جگہ میں تمہاری ماں بن کر تمہیں اپنے سینے سے لگا سکتی ہوں۔ کہو میرا بیٹا بن کر رہو گے میرے ساتھ؟''

غلاما کو لگا جیسے بن مانگے ہی اُس کی مراد پوری ہوئی ہو۔ وہ اُس سے بے ساختہ لپٹ گیا۔ تارا نے اُسے پیار کیا اور پھر اُسے اپنے گھر لے آئی۔ تارا کا گھر غلاما کے گھر سے چار ہاتھ کے فاصلے پر تھا۔ تارا کی بیٹی سرلا بھی غلاما سے انجان نہیں تھی۔ وہ اکثر گلی میں جمع ہو کر ساتھ میں کھیلا کرتے تھے۔ جب تارا نے اُسے بتا دیا کہ اب غلاما بھی اُنکے ساتھ ہی رہے گا تو سرلا اس خبر کو سن کر خوشی سے پھولے نہیں سمائی دونوں بہت جلد ایک دوسرے سے اس طرح ہل مل گئے کہ وہ ایک پل بھی ایک دوسرے سے دور نہیں رہ سکتے تھے۔ غلاما ماں کی ممتا اور بہن کا پیار پا کر اس قدر لہر بہر ہو گیا کہ وہ اپنے سارے اندوہ، غم چند روز میں بھول گیا۔ غلاما کافی ذہین اور ہوشیار تھا۔ تارا نے چاہا وہ بھی سرلا کی طرح پڑھے لکھے مگر اُسے تو پڑھنے لکھنے میں کوئی دلچسپی تھی ہی نہیں۔ اُسے تو پڑھنے لکھنے سے کہیں زیادہ کھیل تماشے میں رغبت تھی۔ وہ کبھی سر کے بل کھڑا ہو جاتا تھا، تو کبھی ایک ڈنڈے کا سہارا لے کر پیڑ پر چڑھ جاتا تھا۔ اُس کے یہ کھیل دیکھ کر سرلا دل تھام کر بیٹھ جاتی تھی۔ قسمت کا کھیل دیکھئے کہ ایک بار غلاما کی ملاقات ایک جادوگر سے ہوئی جو تارا کے پڑوس میں ایک کرایہ دار کی حیثیت سے رہتا تھا۔ یہ جادوگر امرتسر کا تھا اور اس کا نام بلدیو کھوسلہ تھا۔ وہ آئے دن کسی نہ کسی میلے ٹھیلے میں اپنے جادوئی کرتب دکھاتا تھا۔ غلاما نے اُس کے کھیل کرتب کیا دیکھے کہ وہ اُس کا گرویدہ ہو کے رہ گیا۔ کئی روز تک وہ سایے کی طرح اُس کے پیچھے پیچھے پھرتا رہا۔ وہ جہاں بھی جاتا تھا غلاما کو اپنے پیچھے کھڑا پاتا تھا۔ دو ایک روز تک کھوسلہ نے اُسے نظر انداز کیا لیکن تیسرے روز اُس سے رہا نہ گیا۔ اُس نے اُسے اپنے پاس بلایا اور جھلا کے پوچھا ''کیا بات ہے بھئی۔ یہ تم

© Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

میرے پیچھے تھانیدار کی طرح کیوں پڑے ہو؟''

''صاحب جی! میرے کو بھی یہ جادو سیکھنا ہے۔'' اُس نے بڑی سادگی اور معصومیت سے کہا۔

''دیکھو مجھے تمہیں سکھانے میں کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن میں تمہارے ماں باپ کی اجازت کے بنا تمہیں اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔''

ماں باپ کا نام سن کر غلاما کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ رقت بھری آواز میں بولا۔'' صاحب جی میرے ماں باپ نہیں ہیں۔ وہ دونوں مر گئے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ گھٹنوں میں سر ڈال کر پھپھک پھپھک کر رونے لگا۔ بلدیو کھوسلہ اُسے روتے دیکھ کر بڑا آزردہ اور پریشان ہو گیا۔ اُس نے اُسے اپنے قریب کھینچا اور پھر اُس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیر کر بولا۔ ''رو مت میری جان۔ رو مت۔ میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا اور تمہیں بہت بڑا جادوگر بنا دوں گا۔''

غلاما کی آنکھوں میں خوشی کی چمک ایسے ہویدا ہو گئی جیسے بھری برسات میں سورج ایک لحظ کے لئے بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا ہو۔ غلاما جادوگر بننے کے احساس سے ہوا میں اُڑنے لگا۔ وہ سب سے پہلے یہ خبر سرلا کو سنانا چاہتا تھا۔ جب وہ گھر پہونچا اور اُس نے سرلا کو یہ خبر سنائی تو وہ بھی خوشی سے جھوم اُٹھی۔ وہ تمام شب خس آئندہ خیالوں میں کھویا رہا۔ اُسنے دیکھا جیسے وہ بہت بڑا جادوگر بن گیا ہو اور ہزاروں لوگوں کی بھیڑ اکھٹی ہوئی ہے اُس کا کھیل دیکھنے کے لئے۔ لوگ اُس کے ایک ایک کھیل پر واری واری ہوئے جا رہے ہیں۔ نوٹوں کی بارش ہو رہی ہے اور وہ ایک فاتح کی طرح اس بھیڑ کے بیچوں بیچ کھڑا ہے۔ انہی خیالوں میں کھو کر اُسنے پوری رات تیر کر لی۔

بلدیو کھوسلہ نے اُسے اپنے ساتھ کیا رکھ لیا اُسے لگا جیسے اُسنے دونوں جہاں ایکساتھ پا لئے۔ وہ اپنے سارے غم اپنے پیچھے چھوڑ گیا اور تن من سے اپنے اُستاد کی سیوا کرنے لگا۔ اُستاد بھی اُس کی جان نثاری سے ایسا خوش ہوا کہ وہ جب تک اُس کے ساتھ رہا اُسنے اُسے اپنے بچے کی طرح عزیز رکھا۔ جاڑے کی آمد سے پہلے جب وہ وادی چھوڑنے کی تیاری کرنے لگا تو جاتے جاتے اُس نے غلاما کو وردان کے طور پر جادوگری کے ایسے دو چار ٹوٹکے سکھا دئے جو اُس کی روٹی روزی کمانے کے لئے کافی تھے۔ غلاما بھی کافی تیز اور ہوشیار تھا۔ اُسنے بہت جلد اپنے کھیل تماشے سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ لوگوں کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ وہ ہر میلے ٹھیلے میں اپنے کھیل کرتب دکھا کر تماش بینوں کو محظوظ کرتا تھا۔ کبھی کسی تماش بین سے ایک روپیہ کا سکہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

لیا اور پھر یہ سکہ کسی اور تماش بین کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جب واپس مانگا تو سکہ غائب۔ غلاما نے تماش بینوں کے سامنے سے چکر لگاتے ہوئے ایک تماش بین کی ناک پر دھپ مارا تو وہی کھویا ہوا سکہ اُس کی ناک سے گرا۔ لوگ یہ حیرت انگیز تماشہ دیکھ کر خوشی سے اُچھل پڑتے تھے اور بے ساختہ تالیاں پیٹنے لگتے تھے۔

اُس کا دن تو اچھا خاصا کٹتا تھا البتہ رات کی تنہائی اُسے ڈسنے لگتی تھی۔ کہتے ہیں کہ اکیلا ہنستا بھلا نہ روتا۔ یہی حال غلاما کا تھا۔ وہ جب گھر میں قدم رکھتا تھا تو گھر کا سناٹا اُسے کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ وہ پھٹکل جینے کا عادی نہ تھا۔ جب تک وہ اپنے اُستاد کے ساتھ رہا اُسے کبھی بھی اکیلے پن کا احساس نہیں ہوا مگر جس دن وہ یہ شہر چھوڑ کے چلا گیا تھا اُسے لگا کہ جیسے آج وہ سچ مچ کا یتیم ہو گیا ہو۔ وہ اکیلے میں بیٹھ کر چھاجوں روتا تھا۔ اُسے اپنے ماں باپ شدت سے یاد آتے تھے جو اُسے بیچ راستے میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ماں کی جدائی کا غم اُسے کچھ زیادہ ہی تڑپا دیتا تھا۔

غلاما اکیلے ہی زندگی کٹھنائیوں سے لڑ رہا تھا۔ وہ اکیلا ضرور تھا پر اکیلے دو کیلے کا اللہ بیلی ہوتا ہے۔ وہ جب بھی ٹوٹنے لگتا تھا تو وہ تارا سے ملنے چلا جاتا تھا۔

تارا کی ایک تھپکی اُس کے اندر جینے کی اُمنگ جگا دیتی تھی اور وہ پھر سے ایک نئے جوش اور ولولے کے ساتھ میدان میں اُتر جاتا تھا۔ تارا کی ممتا اُس کے لئے ایک ایسی چھاؤں کی طرح تھی جو نہ صرف اُسے حالات کی تیز دھوپ سے بچاتی تھی بلکہ برے سے برے وقت میں اُسے اپنی آغوش میں چھپا کر اُسے تحفظ فراہم کرتی تھی۔

اس بیچ سرلا کی شادی ہو گئی۔ اُس کا شوہر جس کا نام شیام لال تھا! پیشے سے ڈرائیور تھا اور کولگام میں رہتا تھا۔ اُس کی اپنی ایک ٹیکسی تھی جسے وہ خود چلاتا تھا۔

دن میں اچھی خاصی کمائی ہوتی تھی پر رات کو ساری کمائی شراب کی نذر ہو جاتی تھی۔ اُسے مے نوشی کی ایسی لت لگ چکی تھی کی جتنا وہ کماتا نہیں تھا اُس سے کہیں زیادہ اُڑاتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اتنا زیادہ پی لیتا تھا کہ پی کے کسی گندی نالی میں گر جاتا تھا۔ اُس کے سنگی ساتھی اُس کی اس بلا کی مے نوشی سے کافی عاجز آ چکے تھے۔ اُنہوں نے اُسے سدھارنیکی بے انتہا کوشش کی مگر وہ کمبخت تو کتے کی دم نکلا۔ سیدھا ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ بالآخر وہ بھی تھک ہار کر اس موہوم سی اُمید کے ساتھ بیٹھ گئے کہ ایک بار شیام لال ٹھوکانے لگ جائے گا تو آپ ہی آپ سدھر جائے گا۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

چناچہ جب اُس کی شادی کی بات چلی تو اُس کے سنگی ساتھی اور ناتے دار لڑکی والوں کے سامنے اُس کی تعریف میں ایران توران کرنے لگے۔ بات بن گئی اور چٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہو گیا۔ جب وہ دلہن لے کے گھر لوٹا تو ہر کس و ناکس اُس کی قسمت پر رشک کرنے لگا۔ دلہن کیا تھی، چندے آفتاب، چندے ماہتاب۔ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بڑی معصوم اور وفا شعار عورت تھی۔ وہ اُن عورتوں میں سے تھی جو اپنے شوہر کو اپنا مجازی خدا مانتی ہیں۔ شیام لال بیوی کے معاملے میں قسمت کا دھنی ثابت ہوا۔ ایسی بیویاں تقدیر والوں کو ہی ملتی ہیں۔

تارا اس بات سے خوش اور مطمئن تھی کہ اُس کے جیتے جی ہی سرلا کا گھر بس گیا تھا اور وہ اپنی ذمہ واری سے فارغ ہوئی تھی حالانکہ سرلا کی وداعی کے بعد وہ ایکدم اکیلی اور تنہا ہو کر رہ گئی تھی۔ اُس کے بنا تو گھر ایکدم سونا سونا سا لگ رہا تھا۔ وہ جیسے گھر کی ساری خوشیاں اور رونق اپنے ساتھ لے کر چلی گئی تھی۔ غلاما بھی سرلا کے بیاہ کے بعد اپنی اُلجھنوں میں اسطرح اُلجھ گیا تھا کہ چاہ کر بھی وہ تارا کی سدہ نہ لے سکا جس کا اُسے ملال تھا پر وہ بھی کیا کر پاتا۔ اُس پر تو ساری دنیا کا دکھ درد مٹانے کی دھن سوار تھی۔ چناچہ اُس نے اسی دھن کے تحت رشید نام کے ایک لونڈے کو اپنے ساتھ رکھ لیا تھا جس کی ماں کئی سالوں سے کھاٹ پر پڑی تھی۔ جان کنی کے عالم میں ہو کر بھی وہ یہ دنیا آسانی سے چھوڑنے پر آمادہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ اُسے دیکھ کے ایسا لگتا تھا کہ اب مری کہ تب مری کہ بڑی بی ایک دم سنبھالا لیتی تھی۔ اُس کا بیٹا اس ٹمٹماتے ہوئے دیئے کی لو کو کسی بھی حال میں روشن رکھنے کی تگ و دو میں لگا تھا۔ ایک رات جب حالت اچانک بگڑ گئی تو وہ ڈاکٹر کے پاس دوڑا۔ ڈاکٹر نے بہت ساری دوائیاں لکھ کر دیں۔ اُسنے جب ان دوائیوں کی قیمت معلوم کی تو قیمت سن کر اُس کا جی بیٹھا جانے لگا۔ اُسے اتنی بڑی دنیا میں ایک غلاما ہی مددگار کے روپ میں نظر آیا سو وہ بھاگ کر اُس کے پاس گیا اور رو کر اُسے اپنا دکھڑا سنایا۔ غلاما پہلے سے ہی بھرا بیٹھا تھا۔ اُس کی روئداد سن کے وہ برافروختہ ہو کے بولا:

''تم کیا سمجھتے ہو۔ میرے پاس قارون کا خزانہ دھرا پڑا ہے کہ تم جب بھی مانگنے چلے آؤ گے میں تمہاری جھولی نوٹوں سے بھر دوں گا۔ جا چلا جا یہاں سے''

رشید کو ایسے روکھے سے جواب کی قطعی اُمید نہ تھی۔ غلاما کے اس رویے سے اُس کا دل ٹوٹ کے رہ گیا اور وہ باہر بیٹھ کر زار زار رونے لگا۔ غلاما بڑا جذباتی آدمی تھا۔ وہ کسی کی آنکھ میں آنسو نہیں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

دیکھ سکتا تھا پر جب وہ اپنی حالت دیکھتا تھا تو اُس کے دل میں ایک ہوک سی اُٹھتی تھی۔ وہ تو چکی پیس کر اپنا گزارہ چلاتا تھا ایسے میں ننگی کیا نچوڑے کیا نہائے۔ ایکطرف اُس کی اپنی مجبوریاں اور دوسری طرف رشید کے آنسوں نے اُسے لاچار کر دیا تھا۔ وہ کسی بھی قیمت پر اُس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے سوچا اس شہر میں اتنے سارے صاحب ثروت آدمی ہیں۔ کوئی نہ کوئی اس ثواب کے کام میں اُس کا ہاتھ بٹائے گا۔ یہی سوچ کر جب وہ شہر کے بہت بڑے ٹرانسپورٹر حاجی ولی ڈار کے سامنے فریاد لے کر چلا گیا تو یہ دیکھ کر اُسے بڑا گہرا جھٹکا لگا کہ جس شخص کو وہ بڑا نیک اور پارسا سمجھتا تھا وہ تو بڑا بخیل اور رذیل نکلا۔ مدد کی بات سنتے ہی اُس کی تیوری پر بل پڑ گئے اور اُس کا لب ولہجہ ایکدم بدل گیا۔ اُس نے غلاما اور رشید کو ڈانٹ کر گھر سے چلتا کر دیا۔ غلاما اس ذلت اور بے عزتی سے چراغ پا ہو اُٹھا۔ اُس نے باہر آ کر اُسے خوب تبرا بھیجا۔ جب اس سے بھی جی نہ بھرا تو وہ پتھر اُٹھا اُٹھا کر اُس کے دروازے پر مارنے لگا اور ساتھ ہی دشنام طرازی سے اپنے جی کی بھڑاس نکالتا رہا۔ اُس نے جاتے جاتے من ہی من میں یہ قسم کھالی کہ وہ اس کم ذات اور کم ظرف کو مزہ ضرور چکھائے گا۔

اگلے روز حاجی ولی ڈار کے گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ اُن کے گھر میں ایک سانپ گھس آیا تھا۔ یہ ساری کارستانی غلاما کی تھی جو گھر میں بیٹھا بلاوے کا منتظر تھا کیونکہ اس شہر میں وہی ایک تھا جو سانپ پکڑنے میں ماہر تھا۔ ہر کوئی اس مغالطے میں تھا کہ اُس کے پاس سانپ کو بس میں کرنے کا کوئی منتر ہے جب کہ حقیقت یہ تھی کہ وہ کوئی منتر جانتا تھا نہ سانپ کے کاٹے کا اُس کے پاس کوئی علاج تھا۔ وہ جب بھی کوئی سانپ پکڑ کر لاتا تھا تو سب سے پہلے اس بات کی اچھی طرح سے تسلی کرتا تھا کہ سانپ زہریلا تو نہیں ہے۔ وہ خود زہریلے سانپوں سے ڈرتا تھا تاہم وہ لوگوں کا بھرم توڑنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اُس میں نقصان اُسی کا تھا اس لئے اس سہل اعتقادی پر وہ لب سئے بیٹھا رہتا تھا۔ اب حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جس غلاما کو حاجی ولی ڈار نے گھر میں گھستے ہی لتے لے لیا تھا اور اُسے کھڑے کھڑے باہر کا راستہ دکھا دیا تھا۔

اب اُسی کی چمچماتی گاڑی اُسے لینے کے لئے دروازے پر کھڑی تھی اور دو دو نوکر اُس کے انتظار میں دروازے کے باہر آنکھیں بچھائے بیٹھے تھے۔

جونہی غلاما حاجی کی چمچماتی کار میں بیٹھ کر اُس کے گھر پر پہونچا تو حاجی اُسے دیکھ کر اپنا منہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

چھپانے لگا۔ وہ اس قدر نادم و پشیمان نظر آ رہا تھا کہ وہ غلاما سے آنکھیں بھی ٹھیک سے ملا نہیں پا رہا تھا۔ غلاما نے گرد و پیش کا ایک طائرانہ جائزہ لیا اور پھر حاجی کی طرف ترشی سے دیکھ کر بولا۔

''یہ سانپ بہت ہی زہریلا ہے۔ اسے پکڑنے کے پورے پانچ ہزار لگیں گے۔''

''پانچ ہزار'' حاجی ولی ڈار رقم سن کے ایسے چیخا جیسے اندر پھنکارتے ہوئے سانپ نے اُڑ کر اُسے ڈنک مارا ہو۔ وہ اُبل پڑا۔ ''تم ہوش میں تو ہو نا۔ ابھی اتنی لوٹ نہیں مچی ہے کہ ایک مریل سے سانپ کو قابو میں کرنے کے لئے تم اتنی بڑی رقم کا تقاضا کرو گے۔''

غلاما پہلے سے ہی جلا بھنا بیٹھا تھا۔ حاجی کی ان باتوں نے جلتی پر گھی کا کام کر دیا۔ وہ اُسے ترکی بہ ترکی جواب دینا چاہتا تھا پر رشید کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ پتا مار کر بیٹھ گیا۔ اُس نے چپ چاپ اپنا سامان سمیٹا اور وہ کسی سے کچھ کہے سنے بنا باہر کی طرف جانے لگا۔ اُسے جاتے دیکھ کر سب کے چہرے لٹک گئے۔ دفعتاً حاجی کی بیوی جو ایک کونے میں دبکی بیٹھی تھی ایک زخمی شیرنی کی طرح اپنے شوہر کی طرف بڑھی اور اُس پر برستے ہوئے بولی۔

''ہائے ہائے تم آدمی ہو یا قصائی۔ اس وقت ہم سب کی جان پر بن آئی ہے اور تمہیں اس وقت بھی پیسے کی پڑی ہے۔ ہم نہیں رہیں گے تو پھر اس پیسے کو لے کر کیا کرو گے چھاتی پر دھر کر قبر میں لے جاؤ گے کیا؟''

بیوی کی پھنکار سن کر حاجی کے ہوش ٹھکانے آ گئے اور اُسنے پانچ ہزار بڑی بے دلی سے بیوی کے ہاتھ میں تھما دئے اور خود ایکطرف ہو گیا۔ اُس کی بیوی باہر کی جانب دوڑی اور غلاما کو منا کر اندر لے آئی۔ اُس نے اُس کی جھولی میں پانچ ہزار کی گڑی ڈال دی اور پھر وہ ایک کونے میں جا کر اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھ گئی۔ غلاما اتنی بڑی رقم کو حلال کرنے کے لئے سانپ سے خوب آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔ ایک گھنٹے کی اس اُچھل کود کے بعد اُس نے سانپ کو قابو میں کر کے اُسے پٹاری میں ڈال دیا اور پھر وہ سارے پیسے اور پٹاری رشید کے ہاتھوں میں تھما کر تیزی سے وہاں سے نکل گیا۔

زندگی یونہی گزر رہی تھی۔ ایک دن یہ خبر آئی کہ شیام لال کی ٹیکسی کو حادثہ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ جب وہ جموں کا پھیرہ لگا کر گھر لوٹ رہا تھا کہ بانہال میں اُس نے اپنی ٹیکسی شیر پنجاب ڈھابے کے سامنے روک کر بوتل منگائی اور پھر دو چار پیگ پیٹ میں انڈیلنے کے بعد اُس نے کھانا کھالیا۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کھانا کھا کے وہ وہاں سے روانہ ہوا۔

راستے میں نشے کی وجہ سے جھوکے آنے لگے اور قاضی گنڈ کے قریب ایک موڑ پر وہ ایک تیز رفتار ٹرک سے جا ٹکرایا۔ شیام لال تو بچ گیا البتہ اُس کی ٹیکسی کے پرخچے اُڑ گئے وہ شدید طور پر گھائل ہوا تھا۔ پولیس نے اُسے فوراً اسپتال پہونچا دیا۔ پولیس کی بروقت کاروائی سے اُس کی جان بچ گئی ۔ ذرا سی دیر ہو جاتی تو اُس کا بچنا محال تھا۔ سرلا کو جب اس حادثے کی خبر ملی تو وہ ننگے پاؤں اسپتال پہونچ گئی۔ اپنے شوہر کی حالت دیکھ کر وہ چھاتی پیٹنے لگی۔ نرسوں نے اُس کی ڈھارس بندھائی۔ جب تک وہ اسپتال میں پڑا رہا وہ ایک لحظ کے لئے بھی اُس کی کھاٹ سے نہیں ہٹی۔ اپنی بھوک پیاس بھول کر وہ شب و روز وہ اُس کی سیوا کرتی رہی۔ ہفتہ عشرہ کے بعد اُسے اسپتال سے چھٹی مل گئی اور وہ لاٹھی کا سہارا لیکر گھر چلا آیا۔

اگلے روز جب وہ مستری لے کر پولیس تھانے پہونچا جہاں اُس کی ٹیکسی کا ملبہ پڑا تھا تو اپنی ٹیکسی کی دردشا دیکھ کر اُس کا کلیجہ شق ہوا اور وہ چھاتی پکڑ کر نیچے بیٹھ گیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ جس ٹیکسی کو وہ اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتا تھا آج وہ کاٹھ کباڑ کی طرح تھانے کے پچھواڑے میں پڑی تھی۔ اُسے نئے سرے سے کھڑی کرنے میں کم سے کم بیس پچیس ہزار کی رقم درکار تھی۔ اُس کی بدبختی دیکھئے کہ ایک مہینے پہلے گاڑی کی انشورنس کی معیاد ختم ہو چکی تھی اور اُس نے پالیسی کی تجدید کرانی ضروری نہ سمجھی۔ اب وہاں سے ایک دھیلہ ملنے کی اُمید نہ تھی۔ گھوم پھر کے ایک ہی صورت اُسے نظر آ رہی تھی، وہ تھی سرلا کی ماں۔ وہ وہاں سے اُٹھا اور سیدھے گھر پہونچا۔ گھر پہونچتے ہی وہ اپنی اصلیت میں آ گیا۔ اُس نے سرلا کو اپنے سامنے بٹھایا اور بڑی ڈھٹائی سے وہ اُسے اپنے میکے سے پچیس ہزار جیسی موٹی رقم لانے کے لئے ایسے کہنے لگا جیسے اتنی بڑی رقم اُنکے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ سرلا اتنی بڑی رقم کے بارے میں سنتے ہی چکرا کے رہ گئی۔ وہ اپنی ماں کی حالت سے بے بہرہ نہ تھی۔ اُسے پانی پینے کے لئے روز کنواں کھودنا پڑتا تھا۔ ایسے میں ننگی کیا نہائے کیا نچوڑے۔ پہلی بار سرلا نے جی کڑا کر کے شوہر سے کہہ دیا کہ وہ اپنی ماں سے پیسے نہیں مانگے گی۔ شیام لال بڑا خبیث تھا۔ وہ نا سننے کا عادی نہ تھا۔ سرلا کے انکار سے وہ چراغ پا ہوا اُٹھا اور وہ سرلا پر ٹوٹ پڑا۔ وہ اُسے لاتوں اور ہاتھوں سے مارنے لگا اور پھر وہ اُس کے جھونٹے کھسوٹ کھسوٹ کر اُسے زمین پر پٹختا رہا۔ جب وہ چار چوٹ کی مار کھا کر بے حال ہو گئی تو وہ اُسے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اُسی حالت میں چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ باہر آتے ہی وہ سیدھے دیسی دارو کی دوکان میں گھس گیا اور ایک ہی سانس میں اُس نے آدھی بوتل ختم کی۔ رات کو جب وہ گھر لوٹا تو وہ پوری طرح نشے میں غین تھا۔ گھر میں پاؤں دھرتے ہی اُس نے پھر سے ہنگامہ کھڑا کیا۔ اُس نے سرلا سے دوٹوک لہجے میں کہہ دیا کہ جب تک وہ اپنے میکے سے پچیس ہزار کی رقم لے کر نہیں آئے گی تو وہ تب تک اس گھر میں نہیں رہ سکتی اور اگر وہ رقم لانے میں ناکام رہی تو وہ اُسے طلاق دے دے گا۔ طلاق کا نام سن کر سرلا کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ اُس کے پاؤں پر گری مگر اُس پتھر دل نے اُسے گھر سے باہر نکال دیا۔ سرلا رات بھر دروازے کے باہر بیٹھی اپنی قسمت کو روتی رہی۔ بھور ہوتے ہی وہ بس اڈے کی طرف چل پڑی اور سری نگر جانے والی پہلی بس پکڑ کے وہ میکے کے لئے روانہ ہوئی۔

جب وہ سویرے سویرے میکے پہونچی تو اُسے دیکھ کر تارا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ سرلا کی ہیئت کذائی بتا رہی تھی کی اُس پر کوئی افتاد پڑی ہے۔ ماں نے اُسے بہت کریدا پر وہ کہاں منہ سے پھوٹنے والی تھی۔ وہ ماں کو جھوٹ بول بول کر بہلانے کی کوشش کرتی رہی۔ تارا جہاں دیدہ عورت تھی۔ وہ ان جھوٹے دلاسوں سے کہاں بہلنے والی تھی۔ سرلا کے چہرے پر لگے زخموں کے نشان اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ اُس کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔ جب وہ کچھ بتانے کو راضی نہ ہوئی تو وہ غلاما کے پاس دوڑی دوڑی گئی اور اُس سے سرلا کے من کا ٹٹولنے کا کہا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ سرلا بھلے ہی اُس سے کچھ نہ کہے مگر غلاما سے وہ کچھ بھی چھپا کے نہیں رکھے گی کیونکہ وہ اپنی کوئی بھی بات اُس سے چھپا کے نہیں رکھتی تھی۔

جب غلاما سرلا سے ملا تو اُس کے دل کا سارا درد عود کر آ گیا۔ وہ اُس کے سینے میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ غلاما سے اُس کے آنسو دیکھے نہیں گئے، وہ بھی رو پڑا۔ آخر غلاما کے اصرار پر اُس نے اُسے پوری روداد سنا ڈالی۔ غلاما بڑا آزردہ اور پریشان ہو اُٹھا۔ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ شیام لال کس قماش کا آدمی ہے۔ وہ بڑا ہی کمینہ اور کم ظرف آدمی تھا۔ اُسے سمجھانا اپنا سر پتھر سے پھوڑنے کے مترادف تھا۔ غلاما اپنی بہن کا گھر اپنی آنکھوں کے سامنے ٹوٹتے ہوئے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اُس نے سرلا کو اس بات کی یقین دہانی کرائی کہ وہ کسی بھی قیمت پر اُس کا گھر ٹوٹنے نہیں دے گا، چاہے اُس کے لئے اُسے کتنی بڑی قیمت کیوں نہ دینی پڑے۔ اُسنے سرلا کو سمجھا بجھا کر گھر بیچ دیا اور خود وہ اپنے گھر کے کاغذات لے کر نکل گیا۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

وہ اپنے گھر کے کاغذات لے کر کئی لوگوں سے ملا اور اُنہیں پچیس ہزار کے عوض اپنا گھر گروی رکھنے کے لئے کہا مگر لوگ اتنے ستم ظریف نکلے کہ اس کی مدد کرنے کی بجائے اُس کی چٹکیاں لیتے رہے۔ غلاما ان باتوں سے تلملا کے رہ جاتا اور اُٹھ کے چلا جاتا۔ صبح سے شام تک وہ کئی صاحب ثروت آدمیوں سے ملا مگر اُس نے پایا کہ یہ جتنے بھی لوگ ہیں انتہائی خود غرض اور بے ایمان آدمی ہیں۔ یہ سب لوگ بے ایمانی کر کے پیسہ کمانا تو جانتے ہیں مگر عاقبت سنوارنا نہیں جانتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے کوئی اُمید رکھنا بے معنی تھا۔ اُسنے فیصلہ کیا کہ وہ انکے آگے گڑگڑانے کی بجائے ایک بار پھر اپنا آزمودہ فارمولہ اپنائیگا۔ ان لوگوں سے پیسہ نکالنے کا یہی واحد راستہ تھا۔ ان لوگوں کے یہاں گھی سیدھی اُنگلی سے نکلنے کا تو امکان ہی نہیں تھا۔ چار و ناچار اُنگلی ٹیڑھی کرنے کی ضرورت تھی۔ غلاما نے وہی کیا۔

اگلے روز وہ شنکر آچاریہ کی پہاڑی سے ایک سانپ پکڑ کر لے آیا۔ ایک کالا سانپ۔ اُسنے اندھیرا ہوتے ہی وہ سانپ ایک جنگل ٹھیکدار حاجی محمد امین کے گھر میں ڈال دیا۔ جونہی گھر والوں نے گھر میں ایک پھنکارتا ہوا سانپ دیکھا تو سب کی سٹی پٹی گم ہوگئی۔ وہ اپنی جان بچانے کی خاطر کھڑکیوں سے کود پڑے۔ باہر آکر غلاما کی تلاش شروع ہوگئی۔ اس بار غلاما نے سانپ پکڑنے کے لئے پچیس ہزار کی مانگ کی۔ اتنی بڑی رقم سن کر حاجی ہتھے سے اُکھڑ گیا اور وہ غلاما کو لتے لینے لگا۔

''یہاں قارون کا خزانہ نہیں دھرا پڑا ہے میاں۔ خون پسینہ بہاتے ہیں تب جا کے چار پیسے کما لیتے ہیں۔ ہماری مجبوری کا غلط فائدہ اُٹھانے کی کوشش مت کرو۔ خدا کے قہر سے ڈرو۔ اُس کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی۔ وہ جب برسے گی تو تم کہیں کے نہیں رہو گے۔''

وہ چپ چاپ نیک و بد کی بانگ سننے لگا۔ جب حاجی نے دیکھا کہ اُس کی نصیحت کا اُس پر رتی بھر بھی اثر نہ ہوا تو وہ بیوی کی طرف دیکھنے لگا جو کھا جانے والی نظروں سے اُسے گھور رہی تھی۔ خفیف ہو کر اُس نے غلاما کو ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی مگر جب وہ ٹس سے مس نہ ہوا تو حاجی کو اُس کی مانگ ماننی پڑی۔ آخر مرتا کیا نہ کرتا۔ پچیس ہزار کی رقم غلاما کی ہتھیلی پر رکھنی پڑی۔ چناچہ وہ یہ کام اپنے لئے نہیں بلکہ سرلا کے لئے کر رہا تھا اسلئے اُس نے وہ پیسے رشید کے حوالے کر کے اُسے سرلا کو دے کر آنے کے لئے کہا اور خود وہ سانپ پکڑنے کے لئے کمرے کے اندر گھس گیا۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

جونہی اُس نے سانپ کو دیکھا تو اُس کے ہوش اُڑ گئے۔ یہ سانپ بڑا ہی خطرناک اور زہریلا تھا اور وہ غصے سے پھنکار رہا تھا۔ پہلی بار بازی گر کا داؤ اُلٹا پڑ گیا تھا۔ غلاما کے لئے فرار کے سبھی راستے مسدود تھے۔ اُسے کسی بھی طرح اس سانپ کو قابو کرنا تھا کیونکہ وہ اس کام کی پیشگی اُجرت لے چکا تھا۔ وہ دھڑکتے دل سے آگے بڑھا۔ غلاما کو قریب آتے دیکھ کر وہ اور زیادہ پھنکارنے لگا۔ غلاما اُس کے ڈنک سے بچتا بچاتا جونہی اُسے لپکنے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھانے لگا تو اُس نے بجلی کی سرعت سے اُس کے ہاتھ پر ڈنک مارا۔ غلاما کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور اُس کا سر چکرانے لگا۔ اس سے پہلے کہ زہر اُس کے بدن میں تیزی سے سرائیت کر جائے اور وہ کھڑے کھڑے ہی قضا ہو جائے اُس نے لپک کر سانپ کا سر اپنے ہاتھ میں لے کر اُسے کچل ڈالا۔ سانپ کے مرتے ہی اُس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا اور وہ زمین پر گر کر بری طرح تڑپنے لگا۔ تھوڑی دیر تڑپنے کے بعد وہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ٹھنڈا ہو گیا۔

غلاما کی قربانی اکارت نہیں گئی۔ اُس کے اس جذبہ ایثار نے شیام لال کی آنکھیں کھول دیں اور وہ آدمی سے انسان بن گیا۔ غلاما اُسے جینے کا حقیقی مفہوم سمجھا کر اس دنیا سے رخصت ہوا تھا۔

■ ■ ■

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

رشتے

علی پوا کو میں اُن دنوں سے جانتا تھا جب وہ پلیڈیم سینما میں ٹکٹیں بلیک کیا کرتا تھا۔ بڑا بدصورت اور کالا بھجنگ آدمی جسکا منہ نہ ماتھا۔ چیچک نے اُس کے منہ پر یوں دل کھول کر گلکاری کی تھی کہ دور سے دیکھنے پر ایسا لگتا تھا جیسے تارکول کی سڑک پر برسات کے سبب گڈھے ہی گڈھے پڑے ہوں۔ ایسے جھابڑ جھلے کو دیکھ کر اچھے اچھوں کو وحشت ہونے لگتی تھی۔ وہ جتنا بدخو اور بدروتھا اُتنا ہی موذی اور ستمگر۔ ایک تو دس کی ٹکٹ پچاس میں بیچتا تھا اوپر سے ایسی اینٹھ دکھاتا تھا جیسے ٹکٹ دے کر احسان کر رہا ہو۔ اُس سے حیل وحجت کرنا بھڑ کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا۔ ہر دم غصہ اُس کی ناک پر ہوتا تھا۔ بات بات پر وہ چھری کٹاری دکھاتا یا گالی گلوچ پر اُتر آتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی بے درد قصائی کے گھر پیدا ہوا ہو جسے پرائی پیڑا سے کوئی لینا دینا ہی نہیں۔ جو کوئی بھی اُس سے اُلجھنے کی کوشش کرتا تھا تو اُس کے گرگے اُس پر یوں ٹوٹ پڑتے تھے جیسے گدھ مردار جانور پر۔ وہ مار مار کر اُس کا حال حلیہ اسطرح بگاڑ کر رکھدیتے کہ دوبارہ وہ شریف زادہ لال چوک یا اس کے آس پاس کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا اُس کی اس دادا گیری کے گواہ تو سینکڑوں لوگ ہوتے تھے پر کیا مجال کہ کوئی اُسے روکنے یا ٹوکنے کا حوصلہ دکھاس کے۔ تماش بین تو تماش بین، پولیس والے بھی اُس کے آگے بھیگی بلی بن کر رہتے تھے۔ دراصل اُسنے لال چوک کے علاقے میں ایسی دہشت اور دبدبہ بنا کے رکھا تھا کہ کوئی اُس کے خلاف منہ کھولنے کی جرات نہیں کر پاتا تھا۔ جب پانی میں رہنا ہو تو مگر مچھ سے کوئی بیر کیوں لے۔ سچ پوچھئے تو وہ لال چوک کا ایسا بے تاج بادشاہ تھا جس کی اجازت کے بنا یہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سینما ہی لوگوں کی تفریح کا واحد زریعہ تھا۔ جس دن کوئی بھی نئی فلم پلیڈیم میں لگتی تھی تو سینما دیکھنے والوں کی بھیڑ پلیڈیم پر ٹوٹ پڑتی تھی۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

فلم بینوں کے اس انبوہ کو قابو کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ پولیس اس جم عفیر کو دیکھ کر اپنے ہاتھ پہلے ہی کھڑی کر دیتی تھی۔ بھیڑ کو قابو کرنے کے لئے علی پوا اور اُس کے گرگوں کی مدد لی جاتی تھی جنہوں نے اس سینما کو اپنی آماجگاہ بنا لیا تھا۔ ایکبار علی پوا کی فوج میدان میں اُتر گئی تو پھر اس سینما کا اچھا خاصا میدان رزمگاہ میں تبدیل ہو جاتا تھا۔

تماش بین ایسے دم دبا کر بھاگنے لگتے تھے جیسے اُنکے پیچھے شکاری کتے لگے ہوں۔ مجھ جیسے لاغر اور ناتوان آدمی میدان چھوڑ کر بھاگنے میں ہی خیر و عافیت سمجھتے تھے پر کچھ جیالے ایسے بھی ہوتے تھے جنہیں علی پوا کی لاٹھیاں کھانے کا ایسا چسکا لگ چکا تھا کہ جب تک وہ دو چار ڈنڈے نہیں کھاتے تھے اُنہیں فلم دیکھنے میں مزہ ہی نہیں آتا تھا۔

آخر وہ تفریح کیسی جس میں درد اور تکلیف شامل نہ ہو۔ خوشی کا مزہ تب ہی دوبالا ہو جاتا ہے جب یہ رنج و غم کے بعد ملے۔ یہی حال سینما کی ٹکٹ کا بھی تھا۔ اس لاٹھی پونگا کے میدان کارزار سے سرخ رو ہونے کے بعد ہی فلم بینوں کو فلم دیکھنے میں لطف آتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ ایکبار میں نے خود ٹکٹ نکالنے کی حماقت کی تھی۔ انگریزی فلم لگی ہوئی تھی۔ ٹکٹ گھر میں زیادہ رش دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے جونہی ٹکٹ کھڑکی میں ہاتھ ڈالا پتہ نہیں بہت سارے ہاتھ کہاں سے نکل آئے اور گدھ بن کر مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ اتنے سارے ہاتھ جب بیک وقت چھوٹی سی کھڑکی میں گھس گئے تو میرا کمزور ہاتھ اُن ہاتھوں کے بیچ پھنس کر رہ گیا۔ میری نسیں پھٹ پڑیں۔ میں چیخنے چلانے لگا مگر میری آہ و بکا پر کسی نے کان ہی نہیں دھرا۔ میرے ہاتھ سے خون رسنے لگا، تب بھی کسی کو مجھ پر دیا نہ آئی۔ بڑی دیر کے بعد میری جان چھوٹی مگر بہت سارا خون بہانے کے بعد۔ اُس دن کے بعد میں نے قسم کھائی کہ اب میں دوبارہ اس قسم کی حماقت نہیں کروں گا بھلے ہی کھڑکی گھر میں اُلو کیوں نہ بول رہے ہوں۔

یہیں سے علی پوا کے ساتھ میری جان پہچان ہوگئی۔ علی پوا بلا کا مے نوش تھا۔ جب دیکھو کوٹ کی اندرونی جیب میں ایک دارو کا پوا پڑا رہتا تھا۔ گلا سوکھا نہیں کہ پوے کا ڈھکن کھولا اور کھڑے کھڑے دو تین گھونٹ نیٹ پی گیا۔ بس انہی شراب کے پوں کی وجہ سے اُس کا نام علی پوا پڑ گیا تھا۔ دن بھر حرام کی کمائی سے اپنی جیبیں بھرتا تھا۔ کچھ اپنے اہالی موالیوں کی نذر کرتا تھا جنہیں اُس نے اپنی شان بڑھانے کے لئے پال کر رکھا تھا۔ یعنی چوہدری میں سما نہیں رہا تھا۔ بڑھا چھان کے اُس سے پلا چھوٹا نہیں کہ پولیس

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

والے منہ پھاڑ کے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اُن کی منہ بھرائی کر کے جو پیسے بچتے تھے وہ شراب نوشی یا رنڈی بازی میں چلے جاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ کنویں کی مٹی کنویں کو ہی لگتی ہے یعنی کالی کمائی جس حرام کے راستے سے آتی ہے اُسی راستے سے واپس چلی جاتی ہے۔ حرام کی کمائی کا یہ اصول ہے کہ وہ کبھی ایک جگہ ٹکتی نہیں۔ علی پوے نے بے پناہ دولت کمائی مگر اللے تللے کر کے وہ کنگال کا کنگال ہی رہا۔ ایک دن وہ آدھی رات تک خم پر خم چڑھاتا رہا۔ جب وہ پوری طرح نشے میں غین ہو گیا تو وہ اُٹھا اور جھومتے جھامتے گھر کی جانب چل پڑا۔ گہرا اندھیرا تھا۔ راستے میں کہیں جھونک آ گئی اور وہ سیدھے ایک گہری نالی میں جا گرا۔ سر پر گہری چوٹ لگی۔ یہ تو اُس کی قسمت اچھی تھی کہ اتفاقاً وہاں سے ایک پولیس کی جیپ گزری جنہوں نے اُسے نالی سے نکال کر اسپتال پہونچا دیا۔ اگلے روز اُس کے چیلے چانٹوں کو اُس کے گھائل ہونے کی خبر لگی۔ سب لوگ اسپتال کی طرف بھاگے مگر جب دوا دارو کی بات چلی تو کسی نے بھی اپنی گانٹھ گرہ ڈھیلی نہ کی۔ خرچے کا نام سنتے ہی وہ لوگ ایک ایک کر کے وہاں سے کھسکنے لگے۔ دراصل وہ خود کوڑی کوڑی کے محتاج تھے۔ یعنی آپ ہی میاں منگتے باہر کھڑے درویش۔ وہ زمانہ بڑی تنگدستی اور مفلسی کا تھا۔ ایسے لوگوں کی تعداد کچھ زیادہ تھی جنہیں پانی پینے کے لئے روز کنواں کھودنا پڑتا تھا۔ ایک روپیہ کمانے کے لئے خون پسینہ ایک کرنا پڑتا تھا۔ روپے کی بڑی قدر و قیمت تھی۔ آمدن محدود تھی پر اس تھوڑی سی آمدن میں بھی بڑی برکت تھی۔ اُن دنوں کشمیر میں بدحالی اور بھکمری کا دور دورہ تھا۔

علی پوا قبر کا منہ جھانک کر کیا آیا اُس نے کالا دھندہ کرنے سے توبہ تلا کر لی۔ اس حادثے نے علی پوا کی آنکھیں کھول دیں اور وہ حلال اور حرام کی کمائی کے مراد و مطلب سمجھ گیا۔ وہ جب اسپتال سے چھوٹ کر آیا تو اُسنے پلیڈیم سینما کا رخ کرنے کی بجائے ایک سیاسی دبنگ کی کوٹھی کا رخ کیا جس کی اُن دنوں وادی می طوطی بولتی تھی اور جسے علی پوا جیسے غنڈے موالیوں کا سرپرست مانا جاتا تھا۔ وہ علی پوا کی جان نثاری اور وفاداری کا شروع سے ہی قائل تھا کیونکہ اُس کی پارٹی کو برسر اقتدار لانے میں علی پوا جیسے غنڈے موالیوں کا کافی عمل دخل تھا۔ علی پوا جا کے اپنے محسن کے قدموں میں لوٹنے لگا اور تب تک اُس کے قدموں سے لپٹا رہا جب تک اُس نے علی پوا کو جموں کشمیر روڈ ٹرانسپورٹ میں نوکری دلانے کا بھروسہ نہ دیا۔

مجھے اس محکمے میں تازہ تازہ نوکری مل گئی تھی اور نوکری بھی ایسی کہ مجھے تمام ڈرائیوروں اور کلینروں کی حاضری رکھنی پڑتی تھی اور ساتھ ہی اُن کی ڈیوٹی لگانا ہوتی تھی کہ کون کلینر کس ٹرک کے ساتھ جائے گا

CC-0. Kashmir Research Institute. Digitized by eGangotri

اسکا فیصلہ میں کرتا تھا۔ ہزار بارہ سو ملازم اس محکمے میں کام کرتے تھے اور مزے کی بات یہ تھی کہ مجھے سارے کلینروں کے رجسٹریشن نمبراز بر تھے۔ ایک دن جب میں آفس میں بیٹھا تھا کہ علی پوا اپنے دو تین حواریوں کے ساتھ ہاتھ میں آڈر کی کاپی لئے ہوئے میرے آفس میں ایسے سینہ تان کے داخل ہوا جیسے وہ یہاں چھاپہ ڈالنے والا ہو۔ ایک پل کے لئے میری سانس رک گئی اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا جو چھاتی پھلائے میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں دل ہی دل میں حاکمان وقت کو کوسنے لگا جنہوں نے ایسے موالی کو ہمارے گلے منڈھ دیا تھا۔ اس بلا کو قابو میں رکھنا آسان نہ تھا۔ ایک تو وہ شہر کا نامی گرامی غنڈہ بدمعاش اوپر سے حکمران پارٹی کے ایک دبنگ کی ناک کا بال، ایسے میں اس آدمی پر حاکمانہ دھونس جمانا اپنے ہی ہاتھوں اپنی قبر کھودنے کے مترادف تھا۔ بہر حال مجھے اپنا دفتری دستور تو نبھانا ہی تھا سو میں نے اُس کے ہاتھ سے آڈر کی کاپی لی اور اپنے رجسٹر میں اُس کا نام درج کر لیا۔ اُسنے خوش ہو کر میرے ہاتھ میں دس کا ایک کرارا نوٹ رکھا۔ نوٹ دیکھ کے میں ایسے اُچھل پڑا جیسے اُسنے میری ہتھیلی پر دہکتا ہوا انگارہ رکھ دیا ہو۔ میں نے نوٹ لینے سے صاف انکار کر دیا مگر وہ بھی کہاں ہار ماننے والا تھا۔ چنانچہ اُس نے مجھے بڑے پیار سے اپنی گرفت میں اسطرح لے لیا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے وہ نوٹ قبول کرنا پڑا۔

علی پوا ڈیوٹی دینے کے لئے اُتاولا ہوا جا رہا تھا۔ میں جس کسی بھی ڈرائیور سے اُسے اپنے ساتھ رکھنے کے لئے کہتا وہی ایسے بھاگ جاتا تھا جیسے میں نے اُس کے پیچھے باولا کتا چھوڑ دیا ہو۔ دراصل علی پوا کا کردار ایک کھلی کتاب کی طرح تھا۔ اُس کی اصلیت کسی سے پوشیدہ نہ تھی۔ وہ کہتے ہیں نا کہ ڈائن کھائے تو منہ لال نہ کھائے تو منہ لال۔ یہی حال علی پوے کا تھا۔ گو کہ اُسنے سارے برے کاموں سے توبہ کر لی تھی پھر بھی کوئی اُسے اپنے ساتھ رکھنے کے لئے تیار نہ تھا۔ ایک دن مجھے بیٹھے بیٹھے ایک ایسے ڈرائیور کا خیال آیا جو علی پوے کی طرح ہی بلا کا مے نوش تھا۔ اس ڈرائیور کا نام کاشی ناتھ تھا مگر لوگ باگ اُسے کاشی وسکی کے نام سے جانتے تھے۔

کاشی وسکی بڑا مست ملنگ آدمی تھا۔ نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ وہ بس اپنے کام سے کام رکھنا جانتا تھا۔ وہ جب جموں کا پھیرہ لگا کے آتا تھا تو اپنا ٹرک چوکیدار کے متھے مار کر لال چوک پہونچ جایا کرتا تھا اور وہاں وسکی کی ایک بوتل لے کر کسی ڈھابے میں گھس جاتا تھا اور چار چھ پیگ پیٹ میں انڈیل کر جب وہ غین ہو جاتا تھا تو اُٹھکر گھر کی راہ ہو لیتا تھا۔ گھر میں ایک سیدھی سادھی بیوی تھی جو رام

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

جی کی گائے تھی۔ وہ شوہر کی سیوا اٹہل کو ہی اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتی تھی۔ کاشی وسکی گھر میں گھستے ہی اُودھم مچانے لگا تا تھا۔ کبھی بیوی کو بانجھ کہہ کر اُس کے دل وجگر کو چھلنی کر دیتا تھا تو کبھی اُسے گنوار اور پھوہڑ کہہ کر ذلیل کرتا تھا۔ کبھی کھانے میں ذرا سا نقص نکال کر اُسے بڑی بے رحمی سے پیٹا کرتا تھا۔ وہ بھی نہ جانے کس مٹی کی بنی ہوئی تھی کہ اتنے سارے جور و جفا کے باوجود اُف تک نہ کرتی تھی۔

میں نے سوچا کہ علی پوا اور کاشی وسکی کا ملن خوب رہے گا۔ کہنے والے بڑی بے باکی سے کہہ پائیں گے کہ اللہ ملائی کیا جوڑی ایک اندھا، ایک کوڑی۔ میں نے جب علی پوا کی ڈیوٹی کاشی وسکی کے ٹرک کے ساتھ لگا دی تو اُسنے کوئی ہو ہلا نہیں مچایا بلکہ اُلٹا اُس نے علی پوا کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ دراصل کاشی وسکی علی پوا کو بہت پہلے سے جانتا تھا۔ کہتے ہیں شرابیوں کی دوستی بڑی پکی اور اٹوٹ ہوتی ہے۔ شراب اُنہیں ایسے باندھ کے رکھتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی چھایا بن کر رہ جاتے ہیں۔ میرا خیال درست ثابت ہوا۔ کاشی وسکی اور علی پوے میں ایسی جم گئی کہ دوسرے ملازم اُنہیں رشک بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔ علی پوا اتنا کمینہ اور بدذات ہونے کے باوجود کاشی وسکی کی ایسی سیوا اٹہل کرنے لگا کہ دوسرے کلیز انگشت بدندان ہو کر رہ جاتے تھے۔ وہ خرد ماغ اور جھگڑالو ہونے کے باوجود اپنے اُستاد کی ہر بات مان لیا کرتا تھا۔ جہاں پر رات کو ٹرک رک جایا کرتا تھا وہ بیٹھ کر کھانا بنانے لگتا تھا۔ جب کاشی وسکی دو تین پیگ پی کر ترنگ میں آجاتا تھا تو وہ علی پوے کو بلا کر اُسے ایک آدھ پیگ پلا دیتا تھا۔ بس ایک بار دارو چل گئی تو پھر وہ دنیا و مافیہا کو بھول جاتے تھے پر علی پوا کتنا بھی پیئے وہ اپنے ہوش وحواس بہت ہی کم کھو بیٹھتا تھا۔ وہ پی پا کے سب سے پہلے اپنے اُستاد کے سامنے کھانا لگا دیتا تھا۔ کاشی وسکی جیسے تیسے کر کے دو چار نوالے لیکر اوندھے پڑ جاتا تھا۔ علی پوا اُسے کھینچ کھانچ کے ٹرک تک لے آتا تھا اور پھر اُس کے سرہانے کے نیچے تکیہ رکھ کر اور اُس کے اوپر کمبل ڈال کر وہ یوں مطمئن ہو جاتا تھا جیسے وہ چار دام کی تیرتھ کر کے آگیا ہو۔ کاشی وسکی اُس کی فرمابرداری سے بہت خوش تھا۔ راستے میں جو بھی اوپر کی کمائی ہوتی تھی اب وہ اُسے اکیلے ہضم نہیں کرتا تھا بلکہ اُسنے علی پوے کو بھی اس کمائی میں شریک بنا دیا تھا۔ علی پوے کے دن پھر گئے تھے۔ اب تو لگی بندھی آمدن کے علاوہ بھی دوسری آمدنی کی سبیل ہو گئی تھی۔ اب اُسے کوئی بھی اُلٹا سیدھا دھندہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

علی پوا نے اپنی جان نثاری سے اپنے اُستاد کا دل اس حد تک جیت لیا کہ اب وہ اُسے کبھی کبھی رات کو اپنے ساتھ گھر لے آتا تھا اور پھر اُسے اپنے ہی بستر پر سلا دیتا تھا۔ دھیرے دھیرے علی پوا کاشی کی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

زندگی کا جزو لانفیک بن گیا۔ گھر میں سبزی پہونچانی ہو تو علی پوا حاضر ہے۔ جانکی کو ڈاکٹر کے پاس کبھی جانا ہو تو کاشی خود نہیں جائے گا بلکہ علی پوے کو اُس کے ساتھ بھیج دے گا۔ علی پوا ایک بدنام زماں کردار تھا جسکا ماضی سیاہ کاریوں سے بھرا پڑا تھا۔ کہتے ہی کہ بدا چھا بدنام برا۔ علی پوا کا ماضی آسیب بن کر اُس کا پیچھا کرتا رہا۔ جانکی اور علی پوا کی قربت دیکھ کر اڑوسیوں پڑوسیوں کے دل و دماغ میں شک کے کیڑے کلبلانے لگے۔ محلے میں چمیگوئیاں ہونے لگیں۔ اُڑتے اُڑتے یہ خبر ڈرائیوروں تک بھی پہونچ گئی۔ اُنہوں نے اسمیں اپنی طرف سے نمک مرچ لگا کر اسطرح پیش کیا کہ جانکی کی شبہہ ایک رنڈی سے بھی بدتر ہو کر رہ گئی۔ کاشی کے ناتے قرابت دار اس رشتے کو لے کر کافی دکھی اور پریشان تھے۔ محلے کی پنڈت برادری پیٹھ پیچھے کاشی کو تبرہ بھیجتے تھے مگر سامنے کوئی آنا نہیں چاہتا تھا۔ یہاں پر اُنکو اپنی عزت کی فکر ستانے لگتی تھی کیونکہ کاشی بڑا بدگو اور خرد ماغ تھا۔ اُسکو چھیڑنا بھڑ کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے سے کم نہ تھا اسلئے مسلہ یہی بنا رہا کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے۔ باتیں کرنا تو سب کو آتا ہے مگر جہاں قول و فعل کی بات ہو وہاں سب کنی کترانے لگتے ہیں۔ محلے میں آئے دن اسی بات کے چرچے ہوتے رہتے تھے پر کسی مائی کے لال میں علی پوا یا کاشی وسکی کو تنبیہہ کرنے کا یارا نہ تھا۔ اُنکی عدم موجودگی میں تو وہ انکی جی بھر کے غیبت کرتے رہتے تھے مگر جونہی وہ سامنے آجایا کرتے تھے تو سبھوں کو جیسے سانپ سونگھ جاتا تھا۔ اُنہیں دیکھتے ہی ہر ایک کے منہ پر تالا پڑ جاتا تھا۔

ایک دن کاشی وسکی رات کو ہارٹ اٹیک سے مر گیا۔ صبح ہوتے ہوتے برادری کے لوگ جمع ہو گئے اور اُنہوں نے اپنی دیکھ ریکھ میں کاشی کا داہ سنسکار کرا دیا۔

جانکی پچھاڑیں کھا کھا کے رو رہی تھی پر محلے کی عورتیں اُس کی طرف ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں۔ آنسو ایک نہیں کلیجہ ٹوک ٹوک۔ جانکی کی دنیا اُجاڑ اور ویران ہو چکی تھی پر سب کو یہی لگ رہا تھا جیسے یہ سب ڈھول کا پول ہو۔ کوئی اُس کے رنج و غم کو سمجھ ہی نہیں پایا۔ اُنہیں اُس کی ماتم داری ایک ڈھکوسلہ اور آنکھوں سے بہنے والے آنسو مگرمچھ کے آنسو لگ رہے تھے۔ اس شبہ کو اُس وقت تقویت مل جاتی تھی جب علی پوا پاس پڑوسیوں اور رشتہ داروں کی موجودگی میں جانکی کی ڈھارس باندھنے لگتا تھا۔ یہ عالم دیکھ کر سب سے پہلے پڑوسیوں نے کھسکنا شروع کر دیا۔ اُس کے بعد رشتہ دار بھی ایک ایک کر کے سرکنے لگے۔ لے دے کے گھر میں صرف دو ہی بندے رہ گئے۔ علی پوا اور جانکی۔ جانکی سر پر خاک ڈال کے بیٹھی تھی۔ اُسے پتہ ہی نہیں چلا کہ تعزیت پرسی کے لئے آئے ہوئے لوگ اتنی جلدی چلے کیوں گئے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

علی پوا اپنے اُستاد کے اسطرح چلے جانے سے بڑا دکھی اور اُداس رہنے لگا۔ پہلے پوے سے تشفی ہوتی تھی۔ اب تو آدھی بوتل خالی کر کے بھی نشہ نہیں آتا تھا۔ جب بھی وہ بوتل کھول کے بیٹھ جاتا تھا تو سامنے کاشی وسکی بیٹھا ہوا ملتا تھا۔ اُسے کاشی شدت سے یاد آ رہا تھا۔ وہ اُسے لاکھ بھلانے کی کوشش کرتا تھا مگر وہ اُسے بھلائے نہیں بھول رہا تھا۔ وہ جیسے اُس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ علی پوا اتنا سخت گیر اور بے رحم ہونے کے باوجود کبھی کبھی بچے کی طرح بلک بلک کر رونے لگتا تھا۔

کاشی وسکی کے چلے جانے کے بعد علی پوا نے جانکی کے یہاں ہی ڈیرہ ڈال دیا تھا۔ کل تک جو لوگ دبی زبان سے ان دونوں کے رشتے پر سوال اُٹھا رہے تھے اب وہی کھلے عام ان دونوں کے ناجائز رشتے پر حاشیہ چڑھانے لگے۔ ایک دن علی پوا رات کو جب پی پا کے جانکی کے گھر کی جانب بڑھ رہا تھا کہ کسی اندھیرے کونے میں ایک پنڈت لونڈے نے علی پوا اور جانکی کے ناجائز رشتے کے تعلق سے کوئی بات کہی۔ بس پھر کیا تھا۔ ایسا لگا جیسے محلے میں بھیانک طوفان آ گیا ہو۔ علی پوا نے ایسا ہنگامہ مچایا کہ محلے کے سبھی پنڈت گھروں میں دبک کر بیٹھے رہے۔ اُسنے سڑک کے بلب توڑ دئے۔ گھروں کے شیشے پھوڑ دئے۔ اُس کی زبان سے شعلے برس رہے تھے۔ وہ گندی گندی گالیاں دیکر محلے والوں کو للکار رہا تھا مگر کوئی مائی کا لال باہر آ کر اُس سے لوہا لینے کے لئے تیار نہ تھا۔ سبھی گونگے بہرے بنے بیٹھے رہے۔ جب وہ شانت نہ ہوا تو جانکی کو باہر آ کر اُسے رام کرنا پڑا۔ وہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اندر تو لے آئی مگر اندر آ کر بھی وہ اپنی چونچ بند نہ رکھ سکا۔ وہ اُچھل اُچھل کر دشنام طرازی کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد جانکی نے اُس کے سامنے کھانا رکھ دیا۔ پہلے تو اُسنے کھانے سے انکار کر دیا لیکن جب وہ پیچھے پڑ گئی تو اُسنے دو تین نوالے زہر مار کر کھا لئے۔

اس واقعے کے بعد جانکی کو کوئی بات اندر ہی اندر کھائے جانے لگی۔ محلے کے لوگ اُس سے یوں دور دور بھاگتے تھے جیسے اُسے چھوت کی بیماری لگی ہو۔ وہ کسی سے بات کرنا چاہتی تھی تو وہ ایسے کنی کاٹ کے نکل جاتا تھا جیسے اُسے جانتا تک نہ ہو۔ اُنکے اس رویے سے جانکی کا دل ریزہ ریزہ ہو کے رہ جاتا تھا۔ اس محلے میں اُسے ایسا کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا جس کے پاس بیٹھ کر وہ اپنے دکھڑے روئے۔ لے دے کے ایک علی ہی تھا جو اصل میں اس سارے فساد کی جڑ تھا۔ اگر وہ اس سے بھی قطع تعلق کر دے تو پھر وہ کس کے سہارے جئے گی۔ کون اُس کی خیر خبر لینے آئے گا۔ کل کو اگر وہ بیمار پڑ گئی تو کون اس کی سدھ لے گا۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

جانکی کو یہ غم اندر ہی اندر گھن کی طرح کھاتا رہا۔ وہ بڑی حساس اور خوددار عورت تھی۔ اُسے ذلت و بدنامی کی اس زندگی سے عزت کی موت مرنا منظور تھا۔

آخر وہ ایسی زندگی جی کر کیا کرے جہاں اُسے ہر پل رسوائی کی صلیب پر چڑھایا جائے۔ وہ کتنے دن اسی خلجان میں مبتلا رہی۔ آخر ایک دن اُس نے بڑا بے رحم فیصلہ لیا۔ اُسنے زہر کی شیشی میں اس سارے جھنجٹ سے چھٹکارہ پالیا۔ اگلے روز علی پوا جب جھومتے جھامتے گھر میں داخل ہوا تو جانکی کو بے سدھ پا کر وہ دھک سے رہ گیا۔

اُس نے حواس یکجا کر کے جب جانکی کو ہلایا ڈھلایا تو اُس کے بے جان جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ اُس کے حواس فاختہ ہوئے اور وہ شور مچاتے ہوئے پاس کی پولیس چوکی میں چلا گیا۔ پولیس ہبڑ دھبڑ میں اُس کے ساتھ ہولی اور اُنہوں نے لاش کو اپنی تحویل میں لے کر اُسے پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دیا۔ پاس پڑوسی روزنوں اور کھڑکیوں کے درزوں سے تاکا جھانکی کرتے رہے مگر کوئی نیچے نہ آیا اور نہ ہی کسی نے از راہ انسانیت آگے بڑھکر پرسان حال کیا۔ علی پوا تو سدھ بدھ بسرائے بیٹھا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ کبھی گھر کے اندر بھاگتا تو کبھی پولیس اسٹیشن۔ اُس پر عجب اُفتاد پڑی تھی۔ کوئی اُس کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہ تھا۔

پوسٹ مارٹم ہونے کے بعد جانکی کے لواحقین کو خبر کر دی گئی مگر کوئی لاش لینے نہ آیا۔ دو دن تک لاش مردہ گھر میں پڑی رہی مگر کسی نے بھی ٹوہ لینے کی کوشش نہ کی۔ بالآخر پولیس نے یہ لاش علی پوا کو سونپ دی۔ علی پوا یہ لاش لے کر جب محلے میں پہونچا تو آناً فاناً محلے میں سناٹا چھا گیا۔ لوگ اپنے گھروں میں یوں چھپ گئے جیسے باہر وبا پھیل گئی ہو۔ پہلی بار علی پوا نے کئی پڑوسیوں کے دروازے کھٹکھٹائے۔ اُنہیں خدا کے واسطے دئے، اُن کی منت سماجت کی کہ وہ اس بدنصیب عورت پر ترس کھائیں اور اسے مذہبی رسومات کے ساتھ وداع کر دیں مگر کسی کا دل نہ پسیجا۔ کوئی ٹس سے مس نہ ہوا۔ اُن کی اس بے رخی نے علی پوا کے اندر نفرت کے شعلے بھر دئے اور وہ ان سب کو گندی گندی گالیاں دینے لگا۔ وہ بھی اتنے بے شرم اور ڈھیٹ نکلے کہ اتنی ساری گالیاں کھانے کے باوجود وہ اپنے اپنے گھروں میں مردوں کی طرح پڑے رہے اور علی پوا لاش کو صحن میں بے گور و کفن چھوڑ کر وہاں سے لال چوک کی طرف بھاگا۔

علی کے جاتے ہی سب لوگ اپنے اپنے بلوں سے سہمے ہوئے چوہوں کی طرح باہر نکل آئے اور باہر آکر ہوا کو سونگھنے لگے۔ اپنی چھٹی حس کھول کر سب نے یہی قیافہ لگالیا کہ کی علی پوا اس لاش سے پیچھا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

چھڑا کر چلا گیا۔ پھر سے بے شرمی اور بے حیائی کی دہائی دی جانے لگی۔ لاش بغیر کفن کے پڑی تھی۔ کہیں محلے میں کوئی بیماری نہ پھیل جائے اسلئے وہ لاش سے کہیں زیادہ اپنی بقا کے لئے فکر مند تھے اور اس لاش کو جلد سے جلد ٹھکانے لگوانے کی کوشش میں سرگردان تھے۔ بہت دیر تک اس موضوع پر بحث ہوتی رہی کہ آیا اس لاش کا کریا کرم ہو یا اسے دفنا دیا جائے۔ آخر کافی مغز پچی کے بعد محلے کے چند سیانوں نے یہ طے کیا کہ اس لاش کو میونسپلٹی والوں کے حوالے کیا جائے۔ وہ اس لاش کو جلا دیں یا دفنا دیں اس کا فیصلہ وہی کریں گے۔

اس سے پہلے کہ جانکی کی لاش میونسپلٹی والے اُٹھا کر لے جائیں اچانک علی پوا اپنا سر منڈھائے ہوئے کاندھے پر ایک مٹی کی گھاگر لئے ایک بڑی جمعیت کے ساتھ نمودار ہوا۔ اُنکے ساتھ ایک مریل سا برہمن بھی تھا جسے وہ اکھاڑہ بلڈنگ سے پکڑ کر لے آئے تھے۔ علی پوا کی اس فوج کو دیکھ کر محلے میں کھلبلی سی مچ گئی۔ سبھی لوگ ہڑ بڑاہٹ میں اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگنے کی کوشش کرنے لگے تبھی علی پوا نے اُنہیں ایک موٹی سی گالی دیکر رکنے پر مجبور کیا۔ سبھی اپنی جگہ سانس روکے کھڑے ہو گئے۔ علی پوا نے ایک بزرگ کو گندی سی گالی دیکر کہا۔

''دھرم کے ٹھیکدار سالے۔ تم کیا سمجھتے رہے کہ یہ عورت لاوارث ہے۔ میرے ہوتے ہوئے یہ لاوارث کیسے ہو سکتی ہے۔ مانا میں مسلمان ہوں۔ میں وہ سارے رسم نہیں نبھا پاؤں گا جنہیں تمہارے دھرم کے حساب سے نبھانا ضروری ہوتا ہے مگر یہی کیا کم ہے کہ ایک بیٹے کے کاندھوں پر اُس کی ماں کی لاش جائے گی۔''

اس انکشاف سے سب لوگوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ان سب کی حالت ایسی تھی کہ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم۔ اُن پر گھڑوں پانی پڑا تھا اگل بگل میں کھڑے لوگ اپنی اپنی بغلیں جھانک رہے تھے۔ کوئی علی پوا سے آنکھیں ملا نہیں پا رہا تھا۔ علی پوا اور اُس کے شرابی ساتھیوں نے ارتھی کو کاندھا دیا اور وہ سب مل کر ''رام نام ستیہ ہے'' کا ورد کرنے لگے۔ محلے کا ہر شخص بت بنا شرمسار ہو کے کھڑا تھا۔ اُنہیں لگ رہا تھا جیسے اُن کے سامنے اُن کی ماں کی لاش بے گور و کفن پڑی ہے۔ علی پوا اُنہیں بہت بڑا شراپ دیکر چلا گیا تھا۔

■ ■ ■

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

پوسٹ مارٹم

ولی محمد بڈگام کے سرکاری اسپتال کا ایک معمولی سا خدمت گزار تھا جس کا کام اسپتال میں زیر علاج مریضوں کا فضلہ اُٹھانا اُنکی میلی چادریں بدلنا اور اُنکے وارڈ کو صاف رکھنا تھا۔ ولی محمد محنتی آدمی تھا۔ دل میں کچھ بننے کی لگن تھی اسلئے بہت جلد وہ ترقی پا کر کمپونڈر بن گیا۔ اب اُس کا کام طبی آلات کی صاف صفائی کرنا، مریضوں کی مرہم پٹی کرنا یا ڈاکٹر کی لکھی ہوئی دوائی دواخانے سے بنا کر دینا تھا۔ سیال مرکب تیار کرنے میں وہ کافی ماہر ہو چکا تھا۔ خاص طور سے اُس کے ''کٹار میکسچر'' کی بات ہی نرالی تھی۔ وہ جب نزلہ زکام کے کسی مریض کو یہ مکسچر بنا کے دے دیتا تھا تو اس دوائی کی دو ہی خوراک سے اس مرض کی بیخ کنی ہو جایا کرتی تھی۔ ولی محمد کا رتبہ چاہے جو بھی رہا ہو لیکن مزے کی بات یہ تھی کہ گاؤں والوں کی نظر میں ولی محمد کا درجہ کسی ڈاکٹر سے کم نہ تھا۔ چونکہ ڈاکٹر شہر کا ہوا کرتا تھا اسلئے وہ اپنے آپ کو جذباتی طور پر گاؤں والوں سے اسطرح جوڑ نہیں پاتا تھا جیسے ولی محمد جڑا ہوا تھا۔ ڈاکٹر سے کہیں زیادہ گاؤں میں اُس کی ساکھ تھی کیونکہ وہ اسی علاقے کا باسی تھا اور وہ گاؤں والوں کی رگ رگ سے واقف تھا۔ جب بھی گاؤں کی کوئی عورت اس دواخانے میں اپنے درد کا درماں پانے آتی تھی تو وہ ڈاکٹر کے پاس جانے کی بجائے ولی محمد سے ملنا زیادہ بہتر اور آسان سمجھ لیتی تھی کیونکہ وہ بلا جھجک اپنی بیماری اُس کے آگے بیان کرتی تھی۔ ولی محمد نے بھلے ہی کوئی ڈگری حاصل نہ کی ہو البتہ وہ بیماری کی تشخیص کرنے میں کافی تیز اور تجربہ کار تھا۔ وہ انسانی نفسیات کو سمجھنے میں ماہر تھا۔ وہ ڈاکٹر کی موجودگی یا اُس کی عدم موجودگی میں مریض کو ڈسپنسری کے ایک کونے میں لے جا کر پہلے اُس کی نبض دیکھتا تھا اور پھر اندر سے دوائی بنا کر اُسے چپکے سے تھما دیتا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں سچ مچ شفا تھی یا یہ محض اتفاق تھا یہ تو کوئی نہیں جانتا تھا پر سچ تو یہ تھا کہ اُس کے زیر علاج مریضوں میں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

سے بیشتر مریض اُس کی داوؤں سے بہت جلد صحت یاب ہوجاتے تھے۔ یہ بات گاؤں میں کیا پھیلی کہ ولی محمد کے ہاتھ میں شفا ہے تو مریضوں نے ڈاکٹروں کے پاس جانا ہی چھوڑ دیا۔ ولی محمد کے گھر پہ سانجھ سویرے مریضوں کی لائن لگی رہتی تھی جو بھی اُس کے پاس علاج معالجہ کرانے آجاتا تھا تو ساتھ میں کچھ نہ کچھ سوغات ضرور لے کے آتا تھا۔ چاہے دو دیسی انڈے ہوں یا ایک سوکھا مریل سا چوزہ، سوکھے اخروٹ ہوں یا دو مٹھی لال راجماش۔ مکئی کا آٹا ہو یا گھر کی اُگی ساگ سبزی کوئی بھی مریض ولی محمد کے گھر خالی ہاتھ جانے میں شرم محسوس کرتا تھا۔ ولی محمد اب اتنا مصروف ہو گیا تھا کہ کبھی کبھی اُسے سانس لینے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ اسپتال کا ڈاکٹر روپ کشن جو ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری حاصل کر کے آیا تھا دن بھر بیٹھے بیٹھے مکھیاں مارتا رہتا تھا جب کہ ولی محمد مریضوں سے ہمیشہ گھرا رہتا تھا۔ ایک بار روپ کشن نے ڈائرکٹر ہیلتھ کے پاس جا کر ولی محمد کی تحریری طور پر شکایت درج کی۔ شکایت پر فوراً عمل ہوا۔ ڈائرکٹر ہیلتھ نے ڈسپنسری پر چھاپہ مارا اور اس الزام کو سچ پایا۔ اس سے پہلے کی ولی محمد کے خلاف تادیبی کاروائی عمل میں لائی جاتی نہ جانے گاؤں والوں کو کہاں سے بھنک لگ گئی۔ آناً فاناً کیا عورتیں کیا مرد گھروں سے نکل آئے اور اُنہوں نے اسپتال کا گھیراؤ کیا اور تب تک وہاں سے نہیں ہٹے جب تک ولی محمد کے خلاف چل رہی کاروئی کو معطل نہ کیا گیا۔ زندگی کی گاڑی یونہی وقت کی پٹری پر دوڑتی چلی جارہی تھی کہ اچانک کشمیر کے حالات ایسے بگڑے کہ سب کچھ تہس نہس ہو کے رہ گیا۔ حالات ایسے بے قابو ہو گئے کہ اقلیتی فرقے کے لوگ یہاں سے بھاگ کر ملک کی دیگر ریاستوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ بڈگام کے اس اسپتال میں بیشتر ڈاکٹر اور کمپونڈر کشمیری پنڈت تھے جو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے نقل مکانی کر گئے اور اتنی بڑی ڈسپنسری کو ایک ولی محمد اور ایک خاکروب سلام شیخ کے بھروسے چھوڑ کر چلے گئے۔ وادی میں شورش نے تشدد کا رخ اختیار کیا تھا۔ کھلے عام حفاظتی دستوں اور ملی ٹنٹوں میں مسلح جھڑپیں ہونے لگیں۔ ان جھڑپوں میں وردی پوشوں کے ساتھ ساتھ عام شہری بھی زخمی یا ہلاک ہونے لگے۔ اس طرح کی افراتفری کے ماحول میں اسپتالوں اور ڈسپنسریوں کی ذمہ داریاں کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھیں۔ ہومہامہ سے لے کر دودھ پتھری تک بڈگام کا یہ چھوٹا سا اسپتال بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ آئے دن کتنے ہی گھائل اس اسپتال میں مرہم پٹی کے لئے پہونچ جایا کرتے تھے۔ ولی محمد کو صبح سے شام تک ایک ہی ٹانگ پر کھڑا ہو کے کام کرنا پڑتا تھا۔ اب اُس کا ہاتھ بٹانے کے لئے نہ کوئی ڈاکٹر تھا نہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کمپونڈر۔ بس ایک خاکروب سلام شیخ تھا جو اس شورش اور بدنظمی کی وجہ سے آدھا ڈاکٹر بن گیا تھا۔

آئے دن وادی میں کرفیو اور ہڑتال کی وجہ سے زندگی مفلوج ہو کے رہ گئی تھی۔ گھر سے نکلنا کسی جھوکھم سے کم نہ ہوتا تھا۔ ولی محمد سر پر کفن باندھ کر گھر سے نکلتا تھا کیونکہ اُس کے چھوٹے چھوٹے بال بچے تھے۔ اُس کیلئے یہ نوکری ہی جینے کا سہارا تھی۔ چاہے کرفیو ہو یا ہڑتال وہ اپنی جان آفت میں ڈال کر اپنی ڈیوٹی پر پہونچ جایا کرتا تھا۔ صبح سے لے کر شام تک وہ زخمیوں کی مرہم پٹی میں لگا رہتا تھا۔ کبھی کبھی اُسے ہی کسی گھائل کا آپریشن بھی کرنا پڑتا تھا جب کہ کسی کا چیر پھاڑ کرنا اُس کے لئے کسی قتل سے کم نہ تھا۔ شہر میں تو افراتفری مچی ہوئی تھی۔ اس افراتفری میں سارے قاعدے قانون طاقِ نسیان ہو چکے تھے۔ انتظامی مشینری مفلوج ہو کر رہ گئی تھی ایسے میں کسی کو قاعدے قانون کی پرواہ ہی کہاں رہ گئی تھی۔ ہر طرف تو نفسانفسی کا عالم تھا۔ قوم کی فلاح و بہبود کی فکر کرنے والے گوشہ نشین ہو گئے تھے۔

ایک شام ملحقہ پولیس تھانے سے دو سپاہی اُس کے پاس ایک لاش لے کے آئے۔ اُس سے اس لاش کا پوسٹ مارٹم کرنے کے لئے کہا گیا۔ اس سے پہلے اُس نے کسی لاش کا پوسٹ مارٹم تو نہیں کیا تھا البتہ وہ پوسٹ مارٹم کے وقت آپریشن تھیٹر میں موجود رہتا تھا۔ اُس کا کام اوزار آگے بڑھانا ہوتا تھا یا کھوپڑی پر آری چلانا ہوتا تھا کیونکہ کھوپڑی کو کاٹنے میں بڑی طاقت درکار ہوتی تھی۔ ڈاکٹروں کے مقابلے میں ولی محمد کافی مظبوط اور توانا تھا۔ اُس کے لئے کھوپڑی کو الگ کرنا بائیں ہاتھ کا داؤں تھا۔ وہ آری اتنی تیزی سے چلاتا تھا کہ وہاں کھڑے ڈاکٹر اُس کی برق رفتاری دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے۔ کئی بار اُس کے من میں یہ خیال اُٹھا کہ اگر کبھی اُسے بھی پوسٹ مارٹم کرنے کا موقع مل گیا تو وہ کیا کرے گا۔ بس یہی سوچ کر وہ اس کام میں دلچسپی لینے لگا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ایک دن اُس کا یہ خواب سچ ہو جائے گا۔ آج اُس کے سامنے ایک خوبرو نوجوان کی لاش پڑی تھی جسے دیکھ کر اُس پر ہیبت طاری ہو گئی۔ پہلی بار کسی کی لاش دیکھ کر اُس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُسنے پوسٹ مارٹم کرنے سے کلیتہً انکار کر دیا۔ پولیس بہت دیر تک اُس کے سر پر سوار رہی مگر وہ کسی بھی طور آمادہ نہ ہوا۔ مایوس ہو کے وہ اس لاش کو واپس تھانے میں لے گئے۔

پولیس چلی گئی ولی محمد کو لگا جیسے اُسے پھانسی کے پھندے سے آزاد کر دیا گیا ہو۔ سلام شیخ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

پاس ہی کھڑا بڑی معنی خیز نظروں سے اُس کی ہر حرکت پر غور کر رہا تھا۔ پولیس کے چلے جانے کے بعد سلام شیخ نے ولی محمد سے پوچھا۔

''کیا بات ہے برادر۔ آج تم پوسٹ مارٹم کرنے سے اتنا گھبرا کیوں رہے ہو۔؟''

''میں نہیں جانتا'' اُسنے کپکپاتی آواز میں کہا۔ وہ ابھی تک کانپ رہا تھا۔ وہ نیچے بیٹھ گیا۔ اُس کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ گھٹنوں میں سر ڈال کر سسکیاں بھرنے لگا۔

''بات کیا ہے ولی محمد۔ تم رو کیوں رہے ہو؟ آج سے پہلے میں نے تمہیں کبھی اسطرح جذباتی ہوتے دیکھا اور نہ ہی اسقدر کمزور پایا۔ کوئی تو بات ہے جو تمہیں اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے اور جسے تم مجھ سے چھپائے جا رہے ہو۔ دیکھو میں تمہارا دوست ہوں۔ مجھ سے من کی بات کہو گے تو تمہارا من کچھ ہلکا ہو جائے گا۔''

''میرا دل رو رہا ہے سلاما۔ میرا دل رو رہا ہے۔ تم نے اُس نوجوان کو دیکھا۔ کیا عمر ہوگی اُسکی۔ مشکل سے سولہ سترہ کا ہوگا۔ ابھی اُس نے سن بلوغت بھی پار نہ کیا ہوگا کہ بیچارا یوں قضا ہو گیا۔ ارے کوئی اس قتل و غارت کو روکتا کیوں نہیں۔ یہ خونریزی دیکھ کر کسی کا کلیجہ پھٹتا کیوں نہیں۔ کوئی کچھ کہتا کیوں نہیں'' کہتے کہتے وہ سسکنے لگا۔ سلاما پر بھی رقت طاری ہوگئی۔ وہ بھی بڑا افسردہ اور اُداس تھا۔ اُس کی آنکھیں بھی اشک بار ہوگئیں۔

ایک گھنٹے کے بعد ملحقہ پولیس اسٹیشن کا تھانیدار ڈسپنسری میں آدھمکا۔ اُس کے ساتھ پھر اُس نوجوان کی لاش تھی اور ساتھ میں وہ دو سپاہی تھے جو پہلے یہ لاش لے کر آئے تھے۔ اب کے تھانیدار کا رویہ کافی تحکمانہ اور جارحانہ تھا۔ وہ ولی محمد کی طرف شعلہ بار آنکھوں سے دیکھ کر چلایا۔

''کیا سمجھتے ہو تم اپنے آپ کو۔ کیوں تم نے اس لاش کا پوسٹ مارٹم کرنے سے انکار کر دیا؟''

''صاحب میں پوسٹ مارٹم کرنے کا مجاز نہیں ہوں۔ میں ایک معمولی کمپونڈر ہوں۔ کل اگر کسی نے میرے خلاف شکایت کر دی نا تو میں قانونی لپیٹے میں آجاؤں گا۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں قانون شکنی کا مرتکب ٹھہرا جاؤں اور مجھے سزا ہو جائے۔'''' آج تمہیں قانون کا خیال آیا۔ پچھلے چھ مہینوں سے تم اس ڈسپنسری میں بغیر کسی ڈگری کے ہر وہ کام کر رہے ہو جس کی نہ تمہارے پاس کوئی ڈگری ہے اور نہ اختیار۔ تب تمہارا ضمیر کیوں نہیں جاگا۔ تمہیں اپنی ان غیر قانونی طبی کاروائیوں کا خیال کیوں نہ آیا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ تم جو اس چار دیواری کے اندر کر رہے ہو وہ کوئی دیکھ نہیں رہا ہے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

۔قانون ابھی زندہ ہے مرا نہیں ہے۔ایسے پر آشوب حالات میں بھی پولیس اپنا فرض نبھا رہی ہے ۔اسلئے ایک پولیس آفسر کے ناطے اگر میں ابھی تمہیں ان سارے الزامات کے تحت گرفتار کرلوں جن میں ضمانت ملنا بھی ممکن نہیں تو کیا کرو گے تم ؟''

ولی محمد کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔وہ آگے تھانیدار سے کوئی حجت نہ کر پایا۔اُس کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔وہ جانتا تھا کہ یہ تھانیدار کچھ بھی کر سکتا ہے اسلئے وہ اسے ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔وہ سیدھے آپریشن تھیٹر میں گھسا۔سپاہیوں نے لاش کو ٹیبل پر پٹخ دیا اور وہ بڑی بے دلی سے سلاما کے ساتھ مل کر اُس نوجوان کا پوسٹ مارٹم کرنے لگے۔سلاما نے دیکھا کہ ولی محمد کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔یہ منظر دیکھ کر سلاما ہکا بکا سارہ گیا۔اس سے پہلے سلاما نے کبھی بھی ولی محمد کے ہاتھوں پر ریشہ طاری ہوتے نہیں دیکھا تھا۔یہ پہلا موقع تھا جب وہ سوکھے پتے کی مانند کانپ رہا تھا۔اُس کے ہاتھوں سے لاش پر چیرے بھی غلط لگ رہے تھے۔ چنانچہ لاش کا معاملہ تھا۔سو سلاما چپ رہا۔سوچا چیرے غلط بھی لگ جائیں تو کونسی قیامت آجائے گی۔لاش کچھ کہنے سننے سے رہی اسلئے فکر کرنے کا جواز ہی نہیں تھا۔وہ تو خود بھی لاش کے چیر پھاڑ میں لگا رہا۔جہاں دل کیا وہاں چیرہ لگا دیا۔کوئی پرسان حال نہ تھا سو وہ من مانی کرتے رہے۔

پولیس والے اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ ولی محمد ایک معمولی کمپونڈر رہے۔وہ پوسٹ مارٹم کرنے کا مجاز نہیں۔مجاز ہوتا بھی تب بھی اُس کی یہ ساری کاروائی بے معنی تھی کیونکہ وہ پوسٹ مارٹم کے بنیادی اصولوں سے ناواقف تھا۔دراصل پولیس پوسٹ مارٹم کے نام پر خانہ پری کرنا چاہتی تھی ورنہ اُن کی کاروائی اُدھوری رہ جاتی اور کبھی عدالت میں اگر کوئی کیس چلا جاتا تو اُنکو رگڑے لگ جاتے حالانکہ ان باتوں کا امکان کم ہی تھا۔

دھیرے دھیرے ولی محمد پوسٹ مارٹم میں اتنا ماہر ہو گیا کہ وہ کسی بھی لاش کا گھنٹوں میں مکمل پوسٹ مارٹم کر دیتا تھا۔حالات دن بہ دن بگڑتے ہی چلے جا رہے تھے۔جتنا زیادہ تشدد ہوتا تھا اُتنی ہی زیادہ خونریزی ہوتی تھی۔کبھی کبھی تو اسپتال میں لاشوں کے ڈھیر لگ جاتے تھے۔بسا اوقات ولی محمد کو کھانا کھانے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔وہ اکیلے صبح سے شام تک ایک ہی ٹانگ پر کھڑا رہ کے کام کرتا تھا۔کوئی مددگار تو تھا نہیں۔بس ،،ایک خاکروب جو لاش کو ادھر اُدھر سے اُٹھا کر لے جانے میں اُس کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ولی محمد کے پاس ہر عمر کی لاشیں پہونچا دی جاتی تھیں۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بیشتر مہلوکین گولی باری کا شکار ہوتے تھے۔ ولی محمد کا کام ان کے بدن سے گولی نکالنا اور پھر اُن کا پوسٹ مارٹم کرنا ہوتا تھا۔ موت کا سبب واضح تھا پھر بھی پوسٹ مارٹم کرانے کا یہ عمل دیوانے کی بڑ سا لگتا تھا۔ پولیس والوں سے پوچھو تو بس ایک ہی رٹا رٹایا سا جواب ملتا تھا۔ پوسٹ مارٹم کرنا ضروری ہے جب کہ آگے اس رپورٹ کی کہیں ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ زیادتیاں تو دونوں طرف سے ہو رہی تھیں پر کوئی بھی فریق اپنی غلطی ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ دونوں دھڑے ایک دوسرے پر الزام دھرتے تھے۔ چاہے خطا جس کی بھی ہو معصوم انسانی جانیں بلی چڑھتی جا رہی تھی۔

آئے دن لاشوں کی چیر پھاڑ کر کے ولی محمد کا دل ایسا سخت ہو گیا تھا کہ اب یہ لاشیں دیکھ کے اُس پر کوئی اثر ہی نہ ہوتا تھا۔ وہ تو ان لاشوں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتا تھا جیسے ایک قصاب اپنے جانوروں کے ساتھ کرتا ہے۔ اُس کا جی اب تمامتر انسانی جذبات سے یکسر عاری ہو چکا تھا۔ جس دن کوئی لاش نہیں آتی تھی اُسے وہ دن بڑا بے معنی اور بے مصرف سا لگتا تھا۔ اب اُس کی آنکھیں نم نہیں ہوتی تھیں۔ اب اُس کا دل نہیں روتا تھا۔ اب تو ان لاشوں سے کھیلتے ہوئے اُسے بڑا مزہ آتا تھا۔ اُس کی فطرت پر جیسے وحشی جبلت حاوی ہو گئی تھی۔ صبح صبح دواخانے میں داخل ہوتے ہی اُس کی اُنگلیاں چھرا تھامنے کے لئے کلبلانے لگتی تھیں۔ اب تو پوسٹ مارٹم کا یہ دھندہ اُسے فیض پہونچانے لگا تھا۔ ایک دن ایک لاش لائی گئی جس نے کلائی میں سونے کا کڑا پہنا تھا۔ چنانچہ لاش افراتفری کے ماحول میں لائی گئی تھی اسلئے پولیس والوں کی نظر سے یہ سونے کا کڑا بچا رہا۔ دونوں نے اس کڑے کو مل بانٹ کر ڈکار لیا۔ اب وہ ہر لاش کی پہلے جامہ تلاشی لیا کرتے تھے اور اُس کے بعد ہی اُس کا چیر پھاڑ کر دیتے تھے۔ بسا اوقات ایسی بھی لاشیں آجایا کرتی تھیں جو خانگی چپقلش کی بھینٹ چڑھ جاتی تھیں اور ٹھیکرایا تو ملی ٹنٹوں کے سر پھوڑا جاتا تھا یا حفاظتی دستوں کے سر۔ ایسا پوسٹ مارٹم رپورٹ تیار کرنے کے لئے ولی محمد کی منہ بھرائی کی جاتی تھی۔ وہ اسے زنا بالجبر اور قتل کا کیس بنا دیتا تھا جب کہ یہ صاف وشفاف قتل کا کیس ہوتا تھا۔ ولی محمد کا ضمیر مر چکا تھا۔ وہ جو کچھ بھی کر رہا تھا اُسے ان باتوں کا کوئی ملال نہ تھا۔ دراصل اس افراتفری اور لاقانونیت کی آڑ میں کھلے عام لوٹ مچائی جا رہی تھی۔ کوئی پرسان حال نہ تھا۔ ایسے میں ولی محمد کو نسا دودھ کا دھلا رہ جاتا۔ اسی بیچ ایک دن ایک چار سال کے بچے کی لاش جب اُس کے پاس پوسٹ مارٹم کے لئے لائی گئی تو وہ یہ لاش دیکھ کر ایسے تڑپ اُٹھا جیسے یہ لاش اُس کے کسی عزیز کی ہو۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بڑے دنوں بعد اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ وہ بچہ اتنا پیارا اور دلارا تھا کہ کسی کی بھی آنکھ نم ہو سکتی تھی۔ کسی کا بھی کلیجہ پھٹ سکتا تھا۔ وہ بہت دیر تک اُس بچے کو بڑی وارفتگی سے نہارتا رہا۔ بعد میں اُسنے پولیس والوں سے صاف طور پر کہہ دیا کہ وہ اس بچے کا پوسٹ مارٹم نہیں کرے گا۔ اُسمیں اتنا یارا نہ تھا کہ وہ اس معصوم کی چیر پھاڑ کر پاتا۔ پولیس آفسر نے اُسے کافی سمجھایا ،اُسے قانون کا واسطہ دیا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

رات کو جب وہ گھر پہونچا تو وہ کافی اندوہ گین اور افسردہ تھا۔ بیوی نے چائے کی پیالی سامنے رکھی اور پھر اُسے کریدتے ہوئے بولی۔

''کیا بات ہے۔ یوں منہ لٹکائے کیوں بیٹھے ہو۔ کسی سے لڑ کر آ گئے ہو کیا۔؟''

جواب میں اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اور وہ اپنی بیوی سے کچھ نہ بولا کیونکہ اُس کی بیوی ایکدم اُجڑ گنوار تھی۔ وہ کہاں کی بات کہاں لی جاتی۔ وہ تو بس ہر دم اپنا ہی راگ الاپتی رہتی تھی۔ اُس کا شوہر گھر میں گھسا نہیں کہ وہ اپنے دکھوں کی پوٹ کھول کے بیٹھ جاتی تھی۔ اُسے شوہر کا دکھ و درد نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ آج بھی جب وہ بوجھل من سے گھر میں داخل ہوا تو اُس کی بیوی اپنا دفتر کھول کے بیٹھی۔

''کب سے کہہ رہی ہوں کہ یہ دواخانے کا کام چھوڑ دو اور زمین کی دلالی کا کام کرو۔ وہ دیکھو سلہ ڈار نے دلالی کر کے کتنا پیسہ بنا لیا۔ ارے وہ پنڈتوں کی زمین اونے پونے داموں بک رہی ہے۔ میری مانو اور کچھ جائیداد خرید لو۔ دیکھنا ایک سال میں ہمارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ تم سن رہے ہو نا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں ایسے میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ بہرے ہو گئے ہو کیا یا کانوں میں روئی ٹھونس کے بیٹھے ہو۔؟ ہائے اللہ یہ میں کس کے پلے بندھ گئی۔ یہ تو مردوں کے ساتھ رہ کر مردار ہو چکا ہے۔ سنو! گھر میں نون تیل ختم ہو چکا ہے۔ اگر محمد جو کی دوکان کھل گئی ہو تو جا کر گھر کا سارا سامان لے کر آ جاو۔ کیا پتا کب بازار بند ہو جائیں گے اور کب کھلیں گے''

بیوی سے آتے جاتے چار باتیں سننا اُس کے لئے کوئی انوکھی بات نہ تھی کیونکہ یہ تو روز روز کا قصہ تھا۔ انسانی فطرت ہی کچھ ایسی ہے کہ اُسے اپنا دکھ درد تو نظر آتا ہے دوسروں کا نہیں۔ یعنی اپنی پیڑ پرائی باتیں۔ ولی محمد کی بیوی سارہ کو بھی دوسروں کا دکھ و درد دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ تو اس موت کے کاروبار میں بھی اپنا ہی فائدہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسمیں اُس کا کوئی

CC-0. Jammu Research Institute. Digitized by eGangotri

قصور نہ تھا۔ اصل میں وہ چار دیواری کی اسیر بن کر رہ گئی تھی۔ اُسے باہر کی دنیا کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا۔

ولی محمد اپنی بیوی کے طور طریقے سے خوش نہیں تھا۔ وہ تو ہر دم لڑنے بھڑنے کے موڑ میں رہتی تھی۔ اُسنے ولی محمد کا جینا اجیرن کر دیا تھا۔ وہ کہتے ہیں نا کہ بچھڑا کھونٹے کے بل پر کودتا ہے۔ جب سے اُس کا ایک بھائی بندوق برداروں میں شامل ہو گیا تھا تب سے تو اُس کے تیور ہی بدل گئے تھے۔ ایک بار ذرا سی بات پر اُس نے ایسا بکھیڑا کھڑا کیا کہ رات کو اُس کا بھائی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اُس کے گھر پر آدھمکا اور ولی محمد کو بندوق دکھا کر ڈرانے لگا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ چند رشتے دار بیچ میں پڑ گئے اور بات رفت گزشت ہو گئی ورنہ بڑی آفت آجاتی۔ ولی محمد اپنی بیوی کی حرکتوں سے اتنا تاراں و ہراساں تھا کہ وہ اب اپنا زیادہ تر وقت اسپتال میں ہی گزارتا تھا۔

اسی بیچ پبلک کے اصرار پر ایک ڈاکٹر کی طعیناتی کی گئی۔ طارق جاوید نام کا یہ نوجوان ڈاکٹر سری نگر کا رہنے والا تھا۔ اس نے حال حال ہی میں ایم۔ بی۔ بی ایس پاس کیا تھا۔ وہ تو بس نام کے لئے ڈاکٹر تھا۔ مہینے میں ایک دو بار سے زیادہ وہ اس اسپتال میں جھانکنے بھی نہ پایا تھا۔ کبھی کرفیو تو کبھی ہڑتال۔ وہ تو ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو اپنی تنخواہ وصول کرنے پہونچ جایا کرتا تھا۔ اُس دن نہ وہ کرفیو کی پرواہ کرتا تھا و ورنہ ہی اُسے ہڑتال کا ڈر ہوتا تھا۔ بہر حال ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی اس اسپتال میں حکمرانی ولی محمد کی ہی چلتی تھی۔ کبھی کبھی تو ولی محمد ہفتوں اسپتال میں ہی پڑا رہتا تھا۔ زخمیوں کی آمد کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ وہ تو ملک الموت کی طرح کبھی بھی وارد ہوتے تھے اور ولی محمد کو نند اسا کے عالم میں ہی اُنکو مرہم پٹی کرنی پڑتی تھی۔

ایک طوفانی رات وہ اکیلا اسپتال میں سویا پڑا تھا کہ آدھی رات کے قریب اُسے ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ کوئی عورت اسپتال کے باہر زور زور سے چیخ رہی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھا اور دروازے کی طرف جھپاک سے لپکا۔ جب اُسنے دروازہ کھولا تو ایک لڑکی نیم اندھیرے میں اسپتال کے اندر آندھی کے تھپیڑے کی طرح در آئی اور پھر وہ ایک بیڈ کے نیچے جا کر چھپ گئی۔ ولی محمد کو یہ بات سمجھنے میں ذرا سی بھی دیر نہیں لگی کہ وہ لڑکی کافی خوفزدہ اور بدحواس تھی۔ اُسنے کمرے میں ہلکی سی روشنی کی اور وہ بیڈ کے قریب جا کر لڑکی کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا کہ وہ اب یہاں پوری طرح سے محفوظ ہے۔ اب اُسے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لڑکی چند لمحے عجب گومگو کی سی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

حالت میں بیٹھی رہی اور پھر تھوڑے توقف کے بعد وہ بیڈ سے باہر آ گئی۔

جونہی وہ پوری روشنی میں ولی محمد کے آگے کھڑی ہوگئی تو اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی تھی جو ابھی تک دلہن کے پیراہن میں تھی۔ اُس کے ہاتھ پاؤں میں ابھی تک مہندی لگی ہوئی تھی۔ وہ اتنی خوبصورت تھی جیسے آکاش سے اُتری کوئی اپسرا ہو۔ ولی محمد مسحور ہو کر اُسے یک ٹک دیکھتا رہا۔ وہ زخموں سے چور تھی۔ اُس کا لباس جگہ جگہ پھٹا ہوا تھا۔ اُس کی ہیت کذائی بتا رہی تھی کہ اُس کے ساتھ بہت برا سلوک ہوا ہے۔ شاید اُس کی عصمت دری کی گئی تھی۔ اُس کی عزت کو گہن لگ چکا تھا۔ ولی محمد انہی سوالوں میں غلطاں و پیچاں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اُس سے کوئی سوال کرتا وہ خود ہی پھٹ پڑی۔ ''دیکھ اُن ظالموں نے میرا کیا حال کر دیا ہے۔ اُنہوں نے میری عصمت میری آبرو کو تار تار کر کے رکھ دیا۔ میرے ایک دن کے شوہر کو میرے سامنے ذلیل کر کے مار ڈالا۔ میں بڑی مشکل سے اُن کے چنگل سے جان چھڑا کے آ گئی ہوں'' کہ کر وہ دہاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ ''اب میں کیا کروں۔ کس کے لئے جئیوں؟''

ولی محمد کو اُس کے زخموں سے رستے خون سے تشویش ہو رہی تھی۔ اُس نے ڈریسنگ کا سارا سامان نکالا اور پھر اُسے بیڈ پر لیٹنے کے لئے کہا۔ پہلے تو وہ مرہم پٹی کے لئے راضی ہی نہ ہوئی کیونکہ اب اُسے یہ زندگی ایک بوجھ کی طرح لگ رہی تھی مگر ولی محمد کے اصرار پر وہ لیٹ گئی۔ جب ولی محمد کے ہاتھ اس کے مرمریں بدن کو چھونے لگے تو اُس کے اوپر شیطان حاوی ہونے لگا۔ دھیرے دھیرے وہ اپنے آپ کو آگ کی بھٹی میں تپتے ہوئے محسوس کرنے لگا۔ دفعتاً اُسے لگا جیسے اُس کے اندر ایک تلاطم اُٹھ رہا ہو۔ پھر ایک بھیانک طوفان آ گیا اور ولی محمد نے اُس مظلوم لڑکی کے جسم کا ہی نہیں روح کا بھی پوسٹ مارٹم کر ڈالا۔

اگلے روز جب پولیس کی گاڑی گشت پر تھی تو اُنہیں اسپتال کے باہر ایک لڑکی کی نیم برہنہ لاش پڑی ہوئی ملی۔ اُس کا پوسٹ مارٹم ہوا تو اسباب قتل یہ پایا گیا کہ اس لڑکی کے ساتھ پہلے اجتماعی زنا بالجبر کیا گیا تھا اور اُس کے بعد اسے قتل کیا گیا تھا۔ زنا کے سارے ثبوت مل چکے تھے۔ جسم پر مدافعت کے بہت سارے نشانات پائے گئے تھے۔ موت گلا گھونٹنے سے ہوئی تھی۔ اگلے روز اس بہیمانہ قتل کے خلاف زبردست مظاہرہ ہوا۔ مظاہرین میں ولی محمد پیش پیش تھا۔

■ ■ ■

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

نانی خیروالی

ٹھیک چودہ برس بعد جب میں نے اپنے گاؤں میں قدم رکھا تو میری حالت اُس کھوئے ہوئے بچے جیسی تھی جو سالوں بعد اپنی ماں کی گود میں پہونچ گیا ہو۔ اپنے گاؤں کی مٹی کی مہک کو سونگھتے ہی میں دیوانہ ہوئے جا رہا تھا۔ جب تر و تازہ ہوا کے جھونکوں نے میرے گالوں کو چھوا تو مجھے لگا جیسے میں ہوا کے دوش پہ اُڑا جا رہا ہوں۔ ہائے یہ کیسی دیوانگی تھی۔ یہ کیسا کیف و سرور تھا۔ لگا گویا مجھ پر وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی ہو۔ میں جذبات سے اسقدر مغلوب ہوگیا کہ بے ساختہ میں نیچے جھکا اور پھر تھوڑی سی مٹی اُٹھا کر میں نے پہلے یہ مٹی اپنی آنکھوں سے لگالی اور پھر میں اس مٹی کو چومنے لگا۔ یہ مٹی میرے گاؤں کی تھی جہاں میں جنما تھا۔ جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ جہاں میں کھیل کود کر جوان ہوا تھا۔ گو کہ میرا وہ گاؤں اب گاؤں نہ رہا تھا بلکہ بہت بڑا قصبہ بن گیا تھا جہاں اب نہ کوئی کچا مکان اور نہ گھاس پھوسکا کوئی چھجا نہ کوئی چھت دکھائی دے رہی تھا۔ سب کچھ قصہ پارینہ بن چکا تھا۔ وہ لہلہاتے کھیت، وہ قل قل کرتی ندیاں، وہ ہرے بھرے سیب اور اخروٹ کے باغ، وہ کھیل کود کے وشال اور چٹیل میدان، اُن سب کو امیری کا عفریت نگل چکا تھا۔ اب نہ وہ گلی کوچے کہیں دکھائی دے رہے تھے جو برسات کے موسم میں دلدل میں تبدیل ہو جاتے تھے اور نہ وہ چوبارے جن سے یہ گاؤں پہچانا جاتا تھا۔ آج تو ہر طرف بنگلے ہی بنگلے منہ پھاڑے کھڑے نظر آرہے تھے جو چیخ چیخ کر یہاں کی آسودگی اور خوشحالی کا اعلان کر رہے تھے۔ بظاہر سب کچھ بدلا تھا۔ اگر کچھ بدلا نہ تھا تو وہ تھی یہاں کی مٹی کی وہ بھینی بھینی خوشبو جو آج بھی رُوح کو تازگی بخش رہی تھی۔ وہ مست و مدہوش کرنے والی ہواؤں کی نکہت جو بوجھل من اور تھکے ذہن کو فرحت بخشتی تھی اور گاؤں کے بیچ کھڑا وہ بوڑھا چنار جو اپنی خاموش زبان سے ہر آنے جانے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

والے کو اپنی آپ بیتی سنا رہا تھا۔ اس چنار کو دیکھتے ہی مجھے نانی یاد آ گئی۔ یہی وہ جگہہ تھی جہاں اکثر نانی ڈیرہ ڈال کر بیٹھ جایا کرتی تھی۔ تب یہ گاؤں کا بوڑھا چنار عمر رسیدہ ہونے کے باوجود ہرا بھرا اور توانا نظر آتا تھا۔ میں جب اُس چنار کو چھونے کے لئے اس کے قریب چلا گیا تو یہ دیکھ کر میں دھک سے رہ گیا کہ چنار کا بدن چھلنی ہو چکا تھا۔ اُس کے تنے پر گولیوں کے بے شمار نشان تھے۔ اُس کی ڈالیاں سوکھ چکی تھیں۔ پتے جھڑ چکے تھے۔ یہ زخم دیکھ کر میرے اپنے زخم آلا ہو گئے اور میں چنار کے تنے سے لپٹ کر رونے لگا ان چودہ برسوں میں حالات نے وقت کے سینے پر کتنے بے رحم گھاو لگائے تھے۔ امن وسکون کی دیوی پر دہشت کے عفریت نے کس قدر قہر توڑا تھا اسکا گواہ یہ بوڑھا چنار تھا۔ کیا نانی کا بدن بھی اسی طرح زخموں سے چور ہوگا؟ یہ سوال مجھے کب سے مجھے کچوکے مار رہا تھا۔ میرے دل کو برما رہا تھا۔

نانی کا اصل نام خورشی تھا مگر اس نام سے اُسے گاؤں کے چند بڑے بزرگ ہی جانتے تھے۔ ہمارے لئے تو وہ نانی خیر والی تھی۔ نانی کا اپنا ایک بھرا پرا کنبہ تھا۔ اُس کے ہوتے سوتے، ناتے رشتے دار قرب و جوار کے گاؤں میں پھیلے ہوئے تھے۔ وہ ماں بھی تھی اور ساس بھی، نانی بھی تھی اور دادی بھی۔ خالہ بھی تھی اور چاچی بھی۔ چنانچہ وہ بہت سارے رشتوں کا محور تھی مگر اتنے سارے رشتوں میں پیوست ہونے کے باوجود وہ نانی کے نام سے ہی مشہور تھی وہ صرف اپنے کنبے یا ناتے داروں کی نانی نہیں بلکہ اس پورے گاؤں کی نانی تھی۔ نانی بھی ایسی ویسی نہیں بلکہ نانی خیر والی، یعنی سب کے لئے خیر مانگنے والی۔

نانی کے لئے سبھی اپنے تھے۔ کیا ہندو کیا مسلمان۔ گاؤں کے بیچ بہنے والی ندی کے کنارے یہ جو چنار کا پیڑ ہے یہ نانی کا مسکن ہوا کرتا تھا۔ نانی بے خانماں نہیں بلکہ آس مراد والی تھی۔ اُس کا تو حویلی جیسا گھر تھا جسمیں چودہ پندرہ کے قریب کمرے تھے۔ نانی اتنے بڑے گھر میں ٹکتی ہی نہیں تھی۔ اُسے تو یہ وشال سا گھر زندان کی طرح لگتا تھا۔ اُسے کھلی ہوا اور کھلی فضا میں بیٹھنے کی عادت تھی۔ اُسے تو یہ چنار کا پیڑ بڑا مانوس تھا کیونکہ اس اس چنار کے پیڑ کے ساتھ اُس کے مرحوم شوہر کی یادیں جڑی ہوئی تھیں۔ وہ بھی اکثر اسی چنار کے چھتنار سایے میں آ کر بیٹھ جاتا تھا۔ سامنے بہتی ہوئی یہ ندی نہ جانے کب سے قل قل کرتی بہے جا رہی تھی۔ کتنا ہی مینہ برسے، کتنا بڑا طوفان کیوں نہ آئے اس خاموش ندی کو کبھی کسی نے سرکش ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے کنارے صدا اسے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

تھامے رہتے تھے۔ اسی طرح یہ چنار کا پیڑ بھی کتنے ہی تھکے ماندے مسافروں کو نہ صرف اپنی ٹھنڈی چھاؤں میں پناہ دیتا تھا بلکہ جاڑے میں اپنے پتوں کی آنچ سے ٹھٹھرے ہوئے بدن گرما دیتا تھا۔ نانی کو اس چنار کی چھاؤں میں بیٹھ کر ایک انجانا سا کیف اور ایک روحانی سکون مل جاتا تھا۔ یہیں پر نانی کی پنچائیت لگ جایا کرتی تھا۔ یہیں پر گاؤں کی تقدیر لکھی جاتی تھی اور کاتب تقدیر کا کردار خود نانی ادا کرتی تھا۔ نانی کا اس گاؤں میں وہ طنطنہ تھا کہ اُس کی اجازت کے بنا گاؤں میں ایک پتہ نہیں ہلتا تھا۔ وہ ہر کسی کے دکھ سکھ میں آگے آگے ہوتی تھی۔ کسی کو ایک ادنی سا بیل بھی خریدنے جانا ہو تو سب سے پہلے وہ نانی کی چوکھٹ پر حاضر ہو جاتا تھا اور اُس کی خیر و دعا لے کر ہی بیل خریدنے نکل جاتا تھا۔ یہ گاؤں والوں کا اندھ وشواس تھا یا نانی کا شخصیتی کرشمہ تھا کہ جس کام میں اُس کی دعائے خیر شامل ہوتی تھی وہ کام ہمیشہ پورا ہوتا تھا۔ وہ پورے گاؤں کی یہاں پر بیٹھ کر خبر رکھا کرتی تھی۔ کس کے یہاں کب کون جنا، کون مرا۔ کس کے یہاں کب سگائی ہوئی، کب ڈولی اُٹھی ان سب باتوں کا علم نانی کو سب سے پہلے ہو جایا کرتا تھا۔ نانی کے آشیرواد کے بنا کوئی کار خیر ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔ گاؤں کی کوری کنواریاں ہوں یا سہاگنیں، وہ اپنے ماں باپ یا اپنے ساس سسر سے اتنی ڈرتی دبتی نہیں تھیں جتنی وہ نانی سے خائف رہا کرتی تھیں۔ نانی کا دبدبہ ہی کچھ ایسا تھا کہ کیا چھوٹے کیا بڑے سب نانی کی عزت واحترام کیا کرتے تھے۔ وہ چاہے ہندو ہو یا مسلمان نانی کا حرف اول حرف آخر ہوا کرتا تھا۔ کیا مجال کہ نانی کے سامنے سے گزرتے ہوئے کسی بانکی کے سر کا ڈوپٹہ ڈھلک جائے یا کوئی لڑکی کسی لڑکے سے ہنسی ٹھٹھول کرتی ہوئی نظر آئے گاؤں میں قیامت نہ آجائے۔ جب بھی کوئی چھیل چھبیلی اُس کے سامنے سے گزرتی تھی تو اللہ میاں کی گائے بن کے نکل جایا کرتی تھی۔ کسی کے قدم زرا سا بہکے نہیں کہ نانی کی لاٹھی سر پر برس جاتی تھی۔ نانی دیکھنے میں تو ککڑی جیسی لگتی تھی مگر اُس میں ایسا دم خم تھا کہ بڑے بڑے جگا دری اُس کے سامنے پانی بھرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اُس کی ایک دھاڑ میں اچھے اچھوں کے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔ وہ اس گاؤں کی خیر خواہ تھی۔ وہ یہاں کے لوگوں کا بھلا چاہتی تھی اسلئے وہ ہر آتی جاتی چھوکری کو بس یہی سمجھاتی پھرتی تھی کہ شرم وحیا عورت کا زیور ہے۔ جو اس زیور کو اُتار کے پھینک دے سمجھو وہ دین کی رہی نہ دنیا کی۔ لڑکیاں بھی نانی کی باتوں کو گرہ میں باندھ کے رکھ لیا کرتی تھیں کیونکہ نانی نے بڑی دنیا دیکھی تھی۔ اُس کے پاس اتنی بڑی زندگی کا تجربہ تھا اور جو کچھ

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

بھی وہ کہہ رہی تھی وہ اُسی تجربے کی بنا پر کہہ رہی تھی۔ نانی تدبر دانش مندی اور ذہانت کا ایک جیتا جاگتا پیکر تھی۔

ایک بار بشیر احمد کی بیوی حلیمہ جو پیٹ سے تھی دردِ زہ سے تڑپنے لگی۔ اُن دنوں آس پاس میں نہ ہی کوئی اسپتال تھا اور نہ ہی کوئی دائی جنائی دستیاب تھی۔ یوں بھی دایہ گیری کے پیشے کو اُن دنوں اچھی نظر سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ دائی گیری کا فریضہ گاؤں کی بڑی بوڑھیاں ہی سرانجام دیتی تھیں۔ اس گاؤں میں ایک نانی ہی تو تھی جو دائی جنائی کا کام بھی کیا کرتی تھی۔ جب حلیمہ درد کی شدت سے بے حال ہونے لگی تو اسکا مرد سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا کہ اُسے کیا کرنا چاہیے۔ حلیمہ جب بال نوچتے نوچتے چت ہوگئی تو عین اُسی وقت فرضی بوا اپنی لاٹھی ہانکتے ہوئے گھر میں نازل ہوئی۔ فرضی بوا جس کے منہ میں نہ دانت، پیٹ میں نہ آنت پھر بھی وہ اپنے آپ کو جواں جہاں سمجھتی تھی۔ کوئی اُسے بڑی بی کہہ کر بلاتا تھا تو وہ جامے سے باہر ہو جایا کرتی تھی۔ ''ہائے تیرا ستیا ناس موئے۔ لو کے لگ جائیں تمہیں۔ منہ میں دانت نہیں تو کیا میں بوڑھی ہوگئی؟ ارے یہ تو برا ہو اس موئے نزلے زکام کا جس نے میرے دانتوں کو نگل ڈالا ورنہ میں بھی کدکڑے مارتی نظر آتی۔ خبردار جو آئندہ کسی نے مجھے بڑی بھی کہہ کر بلایا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' اگل بغل میں بیٹھے لوگ بوا کی اس لن ترانی پر اپنی ہنسی روک نہیں پاتے تھے۔

فرضی بوا زبان کی ہی کڑوی نہیں دل کی بھی کڑوی تھی۔ کسی کی خوشی اُس سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ دوسروں کی غیبت کر کے ہی اُس کے دل کو سکون ملتا تھا۔ خود رافضیت اور دیگر انصیحت کے مصداق خود تو لگائی بجھائی سے ہی فرصت نہیں پاتی تھی پر دوسروں کو درس دیتے نہیں تھکتی تھی۔ خود تو ایک بار بھی سجدے میں نہیں گری مگر اوروں کو نماز نہ پڑھنے پر خجل و خوار کر دیتی تھی۔ خود تو کسی منگتا فقیر کو ایک پھوٹی کوڑی نہ دیتی تھی پر دوسروں کو زکوۃ نہ دینے پر ڈانٹ دیا کرتی تھی۔ دوسروں کے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کی اُسے بہت پرانی عادت تھی۔ کسی کے گھر میں ذرا سا قضیہ ٹنٹا کیا ہوا کہ فرضی بوا پہونچ گئی پنچائیت لگانے۔ رمضان میر کی اچھی خاصی گھر گرہستی بوا کے کارن ٹوٹ گئی۔ نہ جانے اُس نے رمضان میر کے کان میں کیا پھونک دیا کہ وہ اپنی بیوی سے ایسا متنفر ہو گیا کہ ایک مہینے کے اندر اندر اُس نے اپنی بیوی سے خلع لے لیا۔ بوا کے من کی مراد اپوری ہوئی۔ وہ اصل میں حبلہ کو اپنے رنڈوے بھتیجے کی نکاح میں لینا چاہتی تھی۔ یہ عقدہ تب کھلا جب وہ حبلہ کو اپنے بھتیجے کے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

حق میں ہموار کرنے لگی۔ ایسی پھاپھا کٹنی تھی وہ کہ جہاں جاتی تھی وہیں آگ لگا کر آتی تھی۔ لوگ اس عمر میں اپنی آخرت سنوارنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ ایک وہ تھی جسے آخرت کی فکر نہ عاقبت کی پرواہ۔ جب دیکھو کہیں نہ کہیں بھس میں چنگاری ڈالنے کی تاک میں بیٹھی ہے۔ اب یہ گاؤں والوں کی بزدلی تھی یا اُنکی شرافت کہ کوئی بھی اس چغل خور بوا کے منہ میں لگام ڈالنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ اُنکی اس مروت اور شرافت نے بوا کو شیر بنا دیا تھا۔ دراصل اس گاؤں میں شرافت اور مروت ابھی تک مری نہیں بلکہ زندہ تھی۔ گاؤں والوں کی دیدوں کا پانی ابھی تک ڈھلا نہیں تھا۔

حلیمہ زندگی اور موت کی جس کشمکش سے گزر رہی تھی ایسے میں فرضی بوا بھلا دور کیسے رہ سکتی تھی۔ وہ اتنی عجلت میں دکھائی دے رہی تھی کہ اگر وہ حلیمہ کے پاس جلدی سے نہ پہونچی تو کہیں یہ چلتی پھرتی دنیا رک نہ جائے۔ کہیں حلیمہ کی سانسوں کی ڈور تھم نہ جائے۔ کوئی سامنے آ کے کھڑا ہو جاتا تھا تو وہ اُسے لاٹھی سے پرے ہٹاتے ہوئے برا سا منہ بنا کر آگے بڑھی جا رہی تھی۔ اُس کا دم پھولا ہوا تھا۔ پوپلا منہ ایسے چل رہا تھا جیسے منہ میں انگارے بھرے پڑے ہوں۔ وہ گرتے پڑتے جب حلیمہ کے کمرے تک پہونچ گئی تو اُس نے حلیمہ کو بستر پر بے سدھ پڑا پایا۔ فرضی بوا نے حلیمہ کو ادھر اُدھر ہلایا ڈھلایا۔ جب بے جان جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی تو وہ پیش از مرگ ہی واویلا کرنے لگی۔ اُسے واویلا کرتے دیکھ کر گھر میں کہرام مچ گیا۔ پاس پڑوسی شور سن کر گھروں سے بھاگ کر آئے اور بشیر کو حوصلہ دینے لگے۔ بشیر جو بچے کا منہ دیکھنے کے لئے کب سے ترس رہا تھا، جب اُس نے بوا کو یوں روتے پیٹتے دیکھا تو وہ چکرا گیا۔ بوا کو بین کرتے دیکھ کر اُس کے سر پر گویا بجلی ٹوٹ پڑی۔ وہ غش کھا کر ایسے گر پڑا کہ پاس پڑوسی حلیمہ کو بھول کر اُسے ہوش میں لانے لگے۔ فرضی بوا کو نہ تو بشیر سے کوئی لگاؤ تھا اور نہ ہی حلیمہ کے چلے جانے کا کوئی افسوس۔ وہ تو بس اپنی بڑائی جتانا چاہتی تھی۔ وہ بشیر کے گرد بیٹھے پاس پڑوسیوں پر برس پڑی۔

''ارے تم سب کے سب یہیں کیوں مرے پڑے ہو۔ کوئی اوپر جا کر صورہ یاسین پڑھ کر تو آو۔ کم سے کم نصیبوں جلی کی موت کی سختی تو کم ہو جائے۔'' وہ چیختی چلاتی رہی مگر اُس کی آواز پر کسی نے دھیان ہی نہیں دیا۔ ہر کوئی بدحواسی کے عالم میں ادھر اُدھر بھاگتا رہا۔

گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ فرضی بوا کے کہنے پر گھر والوں نے حلیمہ کو مردہ قرار دیا تھا اور پاس پڑوسی کفن دفن کی تیاریوں میں جٹ گئے تھے کہ کسی نے جا کر نانی کو خبر کر دی۔ نانی بھاگی بھاگی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

چلی آئی اور سیدھے حلیمہ کے کمرے میں چلی گئی۔ اُس نے سب سے پہلے حلیمہ کی نبض ٹٹولی۔ وہ اگل بغل میں کھڑے لوگوں پر برس پڑی اور اُنہیں کمرے سے باہر بھگا دیا۔ بشیر باہر کلیجہ تھام کر بیٹھ گیا۔ نانی کو دیکھ کر من میں ایک موہوم سی اُمید جاگی۔ اس اُمید و بیم کے عالم میں من میں یہ کھٹکا لگا رہا کہ پتہ نہیں کب دروازہ کھلے اور کب نانی کف افسوس ملتے ہوئے باہر نکل آئے۔ لمحے بیتتے چلے جا رہے تھے پر ایسا کچھ ہوا نہیں اندر پراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی اچانک کمرے کے اندر اور باہر عورتوں کی سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔ کوئی گرم پانی کی بالٹی لے کر کمرے کی طرف جا رہی ہے۔ کوئی تیل گرم کرنے کے لئے کچن کی طرف دوڑی چلی جا رہی ہے۔ جتنے بھی مرد تھے باہر دم سادھے بیٹھے تھے۔ بشیر اُن کے بیچ یتیموں جیسی صورت بنائے ہر آتی جاتی عورت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ فرضی بوا ایک کونے میں جلی بھنی بیٹھی نانی کو تبرہ بھیج رہی تھی۔ ''بڑی آئی مسیحا بن کر۔ ساری زندگی ایک وقت کی نماز نہیں پڑھی آ گئی مردوں میں جان پھونکنے والی۔'' وہ بہت دیر سے منہ ہی منہ میں بڑبڑائے جا رہی تھی کہ اچانک کسی نوزائیدہ بچے کی چیخ فضا میں گونجی۔ باہر بیٹھے سبھی مرد خوشی سے اُچھل پڑے۔ حلیمہ نہ صرف بچ گئی تھی بلکہ اُس نے ایک گول مٹول بیٹے کو جنم بھی دیا تھا۔ نانی کی بروقت مداخلت سے زچہ اور بچہ حیات پا گئے تھے۔ بشیر خوشی کے مارے رو پڑا۔ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر نانی کے قدموں میں گر کر اُس کے پاؤں چومنے لگا۔ فرضی بوا اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔ اُسنے اچھی خاصی حلیمہ کو مردہ قرار دیا تھا۔ اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود وہ اپنی شکست تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھی سو وہ غصے سے اپنی لاٹھی زمین پر مار کر بڑبڑ کرتے ہوئے وہاں سے چل دی۔ اس واقعے نے فرضی بوا کی بچی کھچی ساکھ بھی ختم کر دی تھی جب کہ نانی کی عزت اور عظمت دوگنی ہو گئی تھی۔ نانی صحیح معنوں میں ایک مسیحا تھی جسے یہاں کے دکھ درد مٹانے کے لئے خدا نے پیدا کیا تھا۔

نانی کے دبدبے کے باوجود اس گاؤں میں کچھ ایسے واقعات بھی رونما ہوئے جن سے اس گاؤں کی ساکھ پر بٹہ لگ گیا۔ سب سے بڑا واقعہ تھا شبری کا تھا۔ شبری اسی گاؤں کے ایک نیک اور عزت دار باپ نیل کنٹھ کی بیٹی تھی، جو شکل سے بڑی بھولی اور رکھ رکھاو سے بڑی سیدھی سادی لگتی تھی۔ ہوا یوں کہ پاس کے گاؤں میں امرتسر کے ایک منیاری چھوٹے لال کی دوکان تھی جہاں صبح و شام عورتوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ چھوٹے لال کی دوکان پر عورتوں کے حسن و آرائش سے جڑی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ساری چیزیں مناسب داموں پر دستیاب تھیں۔ وہ خود تو بڑا نیک اور اور ایماندار آدمی تھا اور اُس کی نظر بھی صاف و پاک تھی مگر اُس کے چھورے بابولال کی آنکھیں اُلہڑ اور شوخ حسیناؤں کو دیکھ کر پھسلنے لگتی تھیں۔ اُنکا تھل تھل کرتا گدرایا بدن دیکھ کے اُس کے منہ سے رال ٹپکنے لگتی تھی۔ اُس کی حالت اُس پیاسے جیسی ہو جاتی تھی جس نے بڑے دنوں بعد پانی سے لبالب چشمہ دیکھا ہو۔ بابو لال چہرے مہرے سے بڑا سیدھا لگتا تھا جب کہ اُس کی نظر بڑی خراب تھی۔ شبری بھی اُس کے دوکان سے کبھی شیشہ کنگھی، کبھی سرمہ کاجل اُٹھا کر لے آتی تھی۔ وہ کمبخت بنیئے کی اولاد اُدھار کے راستے اُسے شیشے میں اُتارتا چلا جا رہا تھا اور وہ تھی کہ اُس کے دام میں پھنستی چلی جا رہی تھی۔ اُس کی جگہ کوئی دوسری ہوتی تو اُس کی چندیا پر ایک بال نہ چھوڑتی اور بعد میں اُسے ٹھینگا دکھا کے نکل جاتی پر شبری تھی بڑی بھولی۔ وہ دل کے ہاتھوں لٹ گئی۔ وہ کہتے ہیں نا کہ پریت نہ جانے جات کجات۔ شبری کو پتہ ہی نہیں چلا کہ بابولال سرمہ بیچتے بیچتے کب اُس کی آنکھوں کے راستے اُس کے دل میں اُتر گیا۔ شبری اُس کے پیار میں پاگل ہو اُٹھی۔ رام جی کی گائے جیسے دکھنے والی شبری ایک دن بابولال کے ساتھ بھاگ گئی۔ جب یہ خبر گاؤں میں پھیل گئی تو گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ کوئی کشمیری بھلا یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ ایک امرتسر کا چھورا اُن کی چھوری کو لے کر بھاگ جائے۔ یہ تو برہ راست اُنکی عزت پر ڈاکہ ڈالنے کے مترادف تھا۔

شبری نے پورے گاؤں کے منہ پر کالک پوت دی تھی۔ نانی تو اس خبر سے ایسی ٹوٹی کہ دو دن تک اُس کے منہ میں ایک کھلی اُڑ کر نہیں گئی۔ نانی کو منانے کے لئے سارا گاؤں اُس کے گرد اکھٹا ہوا۔ نانی کھانا تو دور ایک بوندھ پانی تک لینے پر آمادہ نہ ہوئی۔ وہ بس اپنے آپ کو ستی رہی کہ اُس کے ہوتے ہوئے ایسی انہونی کیسے ہوگئی۔ ایک چھوری گاؤں کے نام و ناموس پر تھوک کر کیسے پھر ہوگئی۔ گاؤں کے گبرو جوان بابولال کے خون کے پیاسے تھے۔ آخر امرتسر کا ایک منیاری اُن کی عزت پر کیسے ڈاکہ ڈال سکتا ہے؟ پولیس نے خطرے کو بھانپ لیا تھا اسلئے سب سے پہلے اُنہوں نے بابولال کے باپ چھوٹے لال کو لوگوں کے عتاب سے بچانے کے لئے گرفتار کر کے حوالات میں ڈال دیا تاکہ غریب کی جان بھی بچ جائے اور لوگوں کا غم و غصہ بھی قدرے کم ہو جائے۔ ساتھ ہی بابولال کی تلاش میں اُنہوں نے جگہ جگہ چھاپے مارے۔ آخر پولیس کی دو دن کی مشقت رنگ لائی۔ بابولال شبری کے ہمراہ جواہر ٹنل کے پاس پکڑا گیا۔ وہ شبری کو لے کے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

امرتسر بھاگنے کی کوشش میں تھا کہ قسمت دغا دے گئی اور وہ پولیس کے ہتھے چڑھا۔ پولیس نے اُسے مصلحتاً قاضی گنڈ کے تھانے میں رکھا کیونکہ اس بات کا خدشہ تھا کہ لوگ اُسے دیکھ کر مشتعل ہو جائیں گے۔ شبری کو پولیس اپنے ساتھ بڈگام لے آئی۔ اُنہوں نے اُسے ماں باپ کو سپرد کرنے کی بجائے نانی کو سونپ دیا۔ نانی نے شبری کو دیکھا تو اُس کا چہرہ غصے سے تمتما اُٹھا۔ وہ اُسے کراہت سے یوں گھورنے لگی جیسے وہ ایک جیتی جاگتی لڑکی نہ ہو بلکہ سڑے ہوئے پھلوں کی ٹوکری ہو جسے اگر جلدی سے باہر نہ پھینکا گیا تو فضا مکدر ہو سکتی ہے۔ پورے ماحول میں سڑاند پھیل سکتی ہے۔ شبری کی جان سولی پر اٹکی ہوئی تھی۔ دل خوف و ہراس سے ڈوبا جا رہا تھا۔ وہ تو بس اس انتظار میں تھی کہ کس پل نانی کا ہاتھ اشارے کے لئے اُٹھے اور پھر گاؤں والے اُس پر قہر بن کر ٹوٹیں۔ نانی نے بڑی حقارت سے اُس کی طرف دیکھا اور پھر اُس کے منہ پر تھوک کر بولی۔

''جی کرتا ہے تجھے زمین میں گاڑ دوں کیونکہ تو اس گاؤں کی رسوائی کا باعث بنی ہے۔ تو نے اس گاؤں کی تقدس کو پامال کیا ہے۔ تو نے میری برسوں کی عبادت پر پانی پھیر دیا ہے۔ میں نے آج تک کسی کو بددعا نہیں دی پر میں آج تمہیں یہ بددعا دیتی ہوں کہ جس طرح تو نے اپنے ماں باپ کو کسی کو منہ دکھنے کے قابل نہ رکھا اللہ کرے تو بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہ جائے۔

شبری خوب روئی دھوئی، چیخی چلائی، نانی کے پاؤں پڑ کر گڑگڑا کر اُس سے معافیاں مانگتی رہی پر اس سارے خشوع و خضوع کے باوجود نانی ذرا سی نہ پسیجی۔ اُسے اس صدمے نے پتھر کر دیا تھا۔ آخر تھک ہار کر وہ اُٹھی اور اپنے ماں باپ کے ساتھ چلی گئی۔ چھوٹے لال بھی کچھ دنوں کے بعد اپنی دوکان بیچ باچ کر امرتسر لوٹ گیا۔ بیٹے کی ایک بھول نے اُس کی زندگی غارت کر کے رکھ دی تھی۔ اُس کی اچھی بھلی ساکھ مٹی میں ملا کر رکھ دی تھی۔

اس واقعے کے ٹھیک چھ ماہ بعد گاؤں میں چیچک پھیل گئی۔ شبری بھی اس بیماری کی زد میں آ گئی۔ کچھ علاج میں دیر سویر ہونے کے باعث اور کچھ بیماری سے متعلق زیادہ معلومات نہ ہونے کے سبب شبری کے چہرے پر چیچک کے داغ نکل آئے نانی کی بددعا کام کر گئی۔ جب وہ بستر چھوڑ کے اُٹھی تو آئینے میں اپنی بھیانک صورت دیکھ کر وہ ایک چیخ مار کے بے ہوش ہو کے گر پڑی۔ اُس کا خوبرو چہرہ بڑا بھیانک اور بدرو ہو گیا تھا۔ اس صدمے نے اُسے اندر ہی اندر توڑ کر رکھ دیا۔ ڈیڑھ سال تک وہ اندر ہی اندر گھٹتی رہی اور آخر ایک دن اُسے اس گھٹن سے ہمیشہ کے لئے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

چھٹکارا مل گیا۔

مجھے یاد ہے کہ صبح صبح جب میں کاندھے پر کتابوں کا بستہ ڈالے اسکول کی طرف بھاگنے لگتا تھا تو نانی مجھے اسی پیڑ کی ٹھنڈی چھاؤں کے نیچے پھسکڑی مار کر بیٹھی ہوئی ملتی تھی۔ میں جب اُس کے سامنے سے گزرتا تھا تو وہ اشارے سے مجھے اپنے پاس بلاتی تھی اور پھر جیب سے ایک اخروٹ نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہتی۔ ''جا خیر سے جانا اور خیر سے آنا''

وہ سب کے خیر کی متمنی تھی۔ جو بھی اُس کے سامنے سے گزرتا تھا وہ اُس کے لئے خیر کی دعا مانگا کرتی تھی۔ چنانچہ دوسروں کے لئے خیر مانگتے مانگتے اُس کا نام خیر والی نانی پڑ گیا تھا۔ پتہ نہیں وہ کس دنیا کی مخلوق تھی۔ اُسے اپنے سے زیادہ دوسروں کی فکر ستاتی رہتی تھی۔ نانی فرشتوں کی سیرت اور ولیوں کی صفت لے کر پیدا ہوئی تھی جبھی تو اُسے گاؤں کے سبھی بچے بالے اپنے لگتے تھے۔

ایک بار میں نے گل فراش کے باغ سے چوری چھپے دو خوبانیاں توڑ ڈالیں۔ پتہ نہیں کریم مالی نے مجھے کہاں سے خوبانیاں توڑتے ہوئے دیکھا۔ وہ ہاتھ میں ڈنڈا لے کر میرے پیچھے بھاگا۔ میں چیختا چلاتا نانی کے پیچھے جا کر چھپ گیا۔ نانی نے جب کریم مالی کو اپنی جانب بڑھتے دیکھا تو وہ غضب ناک ہو کے کھڑی ہوگئی اور پھر اپنا ڈنڈا ہوا میں لہراتے ہوئے چلائی۔ ''تیرا بیڑا غرق ہو۔ دیکھو تو اس ننھی سی جان کو کتنا دوڑایا تو نے۔''

''اس نے باغ سے خوبانیاں توڑیں ہیں نانی۔'' وہ ہانپتے ہوئے برہمی سے بولا۔

''ہائے ہائے دو خوبانیاں ہی تو توڑ ڈالی ہیں نا، تیرا کلیجہ کاٹ کے تو نہیں لے گیا۔ ارے او نیستی کیوں دو خوبانیوں کے پیچھے اپنی جان ہلکان کئے جا رہے ہو۔ ارے جس کا یہ باغ ہے وہ آج تک یہاں جھانکنے بھی نہیں آیا۔ ایک تم ہو کہ خوامخواہ اپنا خون جلائے جا رہے ہو۔ وہ کہتے ہیں نا تیلی کا تیل جلے مشعلچی کا دل جلے۔ جا اپنی خیر منا۔ آگے سے کسی بھی معصوم کی چھاتی پر یوں سوار مت ہو جانا۔ خدا تمہیں غارت کر کے چھوڑ دے گا۔ دیکھ اس معصوم کا دوڑا دوڑا کے کیا حال کر دیا تم نے۔ اب دیدے پھاڑ پھاڑ کے کیا دیکھ رہا ہے۔ نانی کو پہلے کبھی دیکھا نہیں کیا؟ جا دفا ہو جا یہاں سے۔'' کریم مالی بدر بدر کرتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔ میں ابھی تک ڈرا سہما نانی کے پیچھے کھڑا تھا۔ نانی میری طرف مڑی اور پھر جیب سے ایک اخروٹ نکال کر مجھے دیتے ہوئے بولی۔ ''بچہ! چوری

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کرنا گناہ ہے۔ جو چوری کرتا ہے قیامت کے دن فرشتے آ کر اُس کے ہاتھ کاٹ ڈالتے ہیں۔ پھر کبھی ایسی غلطی مت کرنا۔"

یہ نانی کی باتوں کا اثر تھا یا میرے کمزور دل کا قصور کہ اُس دن کے بعد میں نے پرائے مال پر کبھی نگاہ تک نہ ڈالی۔ ہر بار قیامت والی بات مجھے ڈراتی رہتی تھی۔ پھر ایک دن ایسا بھی آیا جب اس گاؤں کی صدیوں پرانی تاریخ بدل گئی۔ گاؤں دین دھرم کے نام پر بٹ کر رہ گیا۔ پہلی بار مجھے پتا چلا کی نانی مسلمانی ہے اور میں ہندو ہوں۔ جب وادی کے حالات خراب ہو گئے اور اقلیتی فرقے کا چل چلاؤ شروع ہو گیا تو میرے گھر والوں نے بھی اُداسا کس لیا۔ میں نے ماں باپ کو کپڑے لتے باندھتے دیکھا تو میں بڑا حیران ہوا۔ میں نے بڑی معصومیت سے اپنی ماں سے پوچھا۔ "ماں ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"ہم یہ گاؤں چھوڑ کے جا رہے ہیں۔" ماں نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

میں اس خبر سے چکرا گیا۔ میں نے غصہ ہو کر ماں سے کہا۔ "میں کہیں نہیں جاوں گا۔ میں یہیں نانی کے پاس رہوں گا۔" یہ کہکر میں روتا ہوا نانی کے پاس چلا گیا۔ میں نانی کے پلو میں منہ چھپا کر روتے ہوئے بولا۔ "نانی وہ لوگ یہاں سے جا رہے ہیں۔ میں کہیں نہیں جاوں گا نانی۔ میں یہیں تمہارے پاس رہوں گا۔"

نانی کچھ نہ بولی۔ بس بت بنی کھڑی رہی۔ میں اُس کے سامنے روتا بلکتا رہا، تب بھی وہ بس چپ چاپ کھڑی رہی۔ مین حیران و پریشان تھا کہ آخر یہ نانی کو ہو کیا گیا ہے۔ وہ کچھ بولتی کیوں نہیں ہے۔ پہلی بار مجھے نانی پر غصہ آ گیا اور میں روتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

اگلے روز ہم گاؤں چھوڑ کر چلے گئے۔ جانے سے پہلے میں نانی کے پاس دوڑ کر گیا۔ نانی نے مجھے گلے سے لگا لیا اور پھر مجھے ایک اخروٹ دیکر وہ وہاں سے اُٹھ کر چلی گئی۔ میں دیر تک اس اُمید کے ساتھ کھڑا رہا کہ شاید نانی آگے جا کر رک جائے گی اور پھر مجھے خیر سے جانے اور آنے کی دعا دیکر چلی جائے گی، پر ایسا نہ ہوا۔ نانی کے اس رویے سے میرا دل ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ نانی نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ آگے چل کر سرمئی غبار میں کہیں گم ہو کر رہ گئی۔

آج میں ٹھیک چودہ برس کے بعد اپنے گھر لوٹا ہوں۔ پتا نہیں گاؤں والوں کو میری آمد کی خبر کہاں سے مل گئی۔ لوگوں کا ایک ہجوم میری طرف اُمڈ کر چلا آیا اور اُس کے بعد پتا ہی نہیں چلا کہ ہم

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

سب اشکوں کے طوفان میں کیسے بہتے چلے گئے۔ جب کچھ آنسو پچھ گئے تو میں نے نانی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ گاؤں والے مجھے ایک جلوس کی شکل میں اُس جگہ پر لے گئے جہاں نانی نے اپنے لئے ایک نیا بسیرا ڈھونڈ لیا تھا۔ یہ گاؤں کا قبرستان تھا جہاں نانی ابدی نیند سو رہی تھی۔ گاؤں والوں کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ ایک دن دہشت گردوں اور فوج کے بیچ جھڑپ ہوگئی۔ نانی معمول کی طرح چنار کی چھاؤں میں بیٹھی تھی، اُداس اور غمگین کہ گولیوں کی دنادن شروع ہوگئی۔ اس سے پہلے کہ نانی کچھ سمجھ پاتی، وہ فائرنگ کی زد میں آگئی اور اس چنار کے تنے کی طرح نانی کا بدن گولیوں سے چھلنی ہوگیا۔ میری ٹانگوں کو جیسے لقوہ مار گیا اور میں نانی کی قبر پر گر پڑا۔ میں اُس کی قبر کی مٹی پر بڑی عقیدت سے ہاتھ پھیرنے لگا تبھی میرے کانوں میں کسی نے سرگوشی کے انداز میں آکے کہا۔

''اب نانی کی خبر لینے آئے ہو۔ بہت دیر کردی تم نے آنے میں۔ خیر اب آئے ہو تو سہی۔ خیر سے جانا بیٹے۔ خیر سے جانا''

میرے اندر جذبات کا ایک تلاطم سا اُٹھا۔ ایسا لگا جیسے میرا کلیجہ پھٹ کر باہر آگیا ہو۔ میں بچے کی مانند بلک بلک کر رونے لگا۔

■ ■ ■

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بانگی مرغا

جموں کشمیر محکمہ ٹرانسپورٹ کی پندرہ سالہ ملازمت کے دوران میرا واسطہ بھانت بھانت کے لوگوں سے رہا ہے۔ ان میں سے بیشتر اسی محکمے میں کام کرنے والے ڈرائیور اور کلینر تھے۔ میرا کام ان سب کی حاضری کا ریکارڈ رکھنا ہوتا تھا اور اسی ریکارڈ کی بنا پر اُنہیں تنخواہ ادا کی جاتی تھی۔ کچھ ملازم ایسے بھی تھے جو تنخواہ اس محکمے سے وصول کرتے تھے اور کام کہیں اور کرتے تھے۔ یہ دو غلے حرام خور مہینے کے اٹھائیس دن ڈیوٹی سے غیر حاظر رہتے تھے پر تنخواہ ملنے سے دو دن قبل کسی خودرو جھاڑی کی طرح اچانک کہیں نہ کہیں سے اُگ آتے تھے اور بہتی گنگا میں ہاتھ دھو کر چلے جاتے تھے۔ اس بے ایمانی میں میری رضا بھی شامل ہوتی تھی۔ وہ حرام خور سب سے پہلے متعلقہ افسروں کی منہ بھرائی کر دیتے تھے۔ ان افسروں میں میں بھی شامل ہوتا تھا۔ چونکہ اس حمام میں سبھی ننگے تھے اسلئے یہ ساری بے ظابطگی دیکھ کر کسی کے کان پر جوتک نہیں رینگتی تھی۔ سبھی افسر جیسے گونگے بہرے بنے بیٹھے تھے۔ کسی نے بھی اس لوٹ کھسوٹ کو روکنے کی کبھی کوئی پہل نہ کی۔ یہ سلسلہ بس یونہی چلتا رہا۔

اسی محکمے میں طرح طرح کے کردار تھے۔ ایک دلچسپ کردار تبرک شاہ نام کا ڈرائیور تھا جو جب بھی ملتا تھا تو ہمیشہ اپنا ہی رونا روتا رہتا تھا۔ ''صاحب جی! کیا دسوں۔ پنڈی میں جی میرے چاچا کے بیس ٹرک۔ وہ لاہور والے پھوپھا کی بارہ بسیں اور وہ جو پشاور میں ساڑھے موسا جی ہیں اُس کے پاس جی پندرہ ٹیکسیاں وہ بھی سب کی سب ٹیوٹا کمپنی جاپان کیں۔ کب سے میرے پیچھے پڑے ہیں ادھروں آجاو، ادھروں آجاو۔ توڑی تقدیر بنا دیں گے۔ جانے کیوں میں اتھوں تے نکل نہیں پا رہا ہوں۔'' یہ ترانہ وہ برسوں سے گا رہا تھا۔ اب اس میں سچ کتنا تھا اور جھوٹ کتنا یہ تو

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

وہی جانے پر مجھے اس بات سے حیرانی ہوتی تھی کہ بگانی کھیتی پر جھینگر کیوں ناچے۔ یعنی دوسروں کے مال پر وہ کیوں اٹھلاتا رہتا تھا؟ اُس کے پاس ایسی کوئی دستاویز تو تھی نہیں جس سے یہ ثابت ہو کہ یہ ساری جائیداد اُسی کو ملنے والی ہے۔ مانا کہ پنڈی کے چاچا کے پاس بیس ٹرک ہیں۔ وہ تھوڑے ہی یہ سارے ٹرک اپنے بھتیجے کو بخش دے گا۔ اُس کا بھی تو اپنا پریوار ہوگا۔ وہ تو بس راولپنڈی اور لاہور سے رشتہ ملا کر اپنا قد بڑھانا چاہتا تھا جسمیں وہ کسی حد تک کامیاب بھی رہا تھا۔ پہلے پہل تو میں بھی اُس کی باتیں سن کر مرعوب ہونے لگا تھا۔ بعد میں جب میں نے دیکھا کہ یہ اُس کے روز کا وتیرہ بن چکا ہے تو میں اُس سے کنی کاٹنے لگا۔ وہ جتنا شیخی باز تھا اُتنا ہی اکل کھرا۔ وہ اپنے آپ کو بڑا زیرک اور عقلمند سمجھتا تھا۔ اپنے آگے وہ کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں تھا۔ اپنی ذات برادری والوں کو تو وہ منہ ہی نہیں لگاتا تھا۔ کلیزوں کو تو وہ خدا کی بنائی ہوئی سب سے کمتر مخلوق سمجھتا تھا۔ ان سے بات کرنا بھی وہ کسر شان سمجھتا تھا۔

اس محکمے میں ہر رنگ کے کردار تھے۔ کچھ اتنے بدرنگ تھے کہ اُنہیں پاس بٹھانا بھی گوارہ نہیں ہوتا تھا۔ کچھ اتنے دلچسپ تھے کہ ایسے کرداروں سے ملنے کے لئے میں ہر دم بے قرار رہتا تھا۔ اس محکمے کی ایک خوبی یہ تھی کہ یہاں جو بھی آتا تھا کچھ دنوں کے اندر اُس کا کوئی اور نام پڑ جاتا تھا اور وہ اصلی نام سے کم اور اپنے لقب سے فوراً پہچانا جاتا تھا۔ ایسے ہی دو ڈرائیور تھے۔ ایک کا نام گلہ چرسی تھا اور دوسرے کا نام کاشی وسکی تھا۔ جیسا کہ ان کے القاب سے ہی ظاہر ہے وہ دونوں بلا کے مے نوش تھے۔ گلہ چرسی صرف دارو پر ہی اکتفا نہیں کرتا تھا بلکہ وہ کبھی کبھی چرس کے دو چار کش بھی لگا لیتا تھا۔ دونوں ایک جان دو قالب تھے۔ ایسا بہت کم ہوتا تھا جب یہ دونوں الگ الگ نظر آئے ہوں۔ ہر دم سایے کی طرح ساتھ ساتھ پھرتے تھے۔ دونوں ایک ساتھ کام پر آتے تھے، ایک ساتھ پھیرہ لگاتے تھے۔ ایک ساتھ بیٹھ کر کھاتے پیتے تھے اور ایک ساتھ گھر لوٹتے تھے۔ ان میں بہت ساری چیزیں مشترک تھیں۔ دونوں ایک ہی محلے گاوکدل میں رہتے تھے۔ دونوں ہم عمر تھے۔ دونوں شادی شدہ تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ایک رنڈوا تھا اور ایک شادی شدہ ہو کے بھی رنڈوے کی سی زندگی گزار رہا تھا۔ کاشی وسکی کی بیوی آٹھ سال قبل حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے مر چکی تھی جب کہ گل چرسی کی بیوی حلیمہ کا ایک پاؤں میکے میں اور ایک سسرال میں رہتا تھا۔ وہ گل چرسی کی مے نوشی سے کافی دکھی اور آزردہ تھی۔ وہ جب رات کو پی پا کے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

گھر میں آ دھمکتا تھا تو آتے ہی بیوی پر دھونس جمانے لگتا تھا۔ بیوی بھی بڑی تنک مزاج اور جھگڑالو تھی۔ رات بھر دونوں میں خوب جوتم پیزار ہوتا تھا۔ گل چرسی کو یہ بات کسی بھی قیمت پر گوارہ نہ تھی کہ کوئی اُسے پینے پر روکے یا ٹوکے۔ حلیمہ بھی نہ موقع محل دیکھتی تھی نہ وقت بس ایک بار جو اُس کی زبان چل پڑتی تھی تو پھر رکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ گل چرسی اس ٹیں ٹیں سے ایکدم اپنا آپا کھو بیٹھتا تھا اور وہ پھر حلیمہ کی جم کر پٹائی کرتا تھا۔ رات کو گھر میں خوب ہنگامہ رہتا تھا۔ بھور ہوتے ہی حلیمہ روٹھ کے میکے چلی جاتی تھی۔ محلے والے اس روز روز کے حیص بیص سے اسقدر عاجز آ چکے تھے کہ وہ یہ محلّہ چھوڑ کر کہیں اور جا کے رہنا چاہتے تھے۔ گل چرسی سے کچھ کہہ نہیں پاتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ گل چرسی غنڈہ موالی ہے اُس سے کچھ کہنا بھڑ کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا۔ ویسے بھی اُس کا کچھ نہیں بگڑنے والا۔ بے حیا کی رد بلا۔ وہ تو شرم وحیا سب طاق پر رکھ کے بیٹھا تھا۔ وہ عزت دار لوگ تھے۔ مفت میں، محلے بھر میں اُنکی ہی تھڑی تھڑی ہو کر رہ جاتی اسلئے طوعاً و کراہاً وہ ہر روز زہر کا یہ گھونٹ پی کر رہ جاتے تھے اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا تھا۔

گل چرسی اور کاشی وسکی کی دوستی ایسی پکی اور کھری تھی کہ اگر ایک کو چوٹ لگتی تھی تو درد دوسرے کو ہوتا تھا۔ یہ رام لکھن کی جوڑی پورے سری نگر میں مشہور تھی۔ یہ لوگ یارڑ میں ہوں یا کسی ریسٹورنٹ میں جب دیکھو چونچ سے چونچ ملائے بیٹھے ہیں جب کہ دوسروں سے بہت کم بولتے تھے۔ اپنی ذات برادری سے بھی یہ الگ تھلگ ہی رہتے تھے۔ یہ نہ یونین کی کسی میٹنگ میں شامل ہوتے تھے، اور نہ ہی کسی کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے تھے۔ کچھ لوگوں کو اُنکی یہ دوستی پھوٹی آنکھ نہ بھاتی تھی اسلئے وہ ان میں پھوٹ ڈالنے کے سبھی داو پیچ آزمانے لگے۔ کمال کی بات یہ رہی کہ انکے حریفوں نے ان دونوں کو الگ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا مگر ہر بار اُنہیں منہ کی کھانی پڑی۔ یہ لوگ کسی کے بہکاوے میں آئے نہ ان کی یاری پر کوئی حرف آیا۔ انکی یاری دوستی ان تھپیڑوں کے ساتھ اور زیادہ مظبوط اور مستحکم ہوتی چلی گئی۔

گل چرسی بڑا کم گو اور خاموشی پسند تھا پر وہ جب بھی بولتا تھا تو اُس کا انداز بڑا فلسفیانہ ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اُس کے اندر کسی مفکر کی روح حلول کر گئی ہو۔ وہ جب بھی بولنے لگتا تھا تو غیر ضروری محاوروں کا بے دریغ استعمال کرتا تھا۔ کچھ محاورے خود اُس کے پلے نہیں پڑتے تھے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اور کچھ سننے والے کے۔ ایک دن مجھے آفس میں ملا تو میں نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

''کیا گل جانا، تم تو ہم کو ایکدم بھلا ہی چکے ہو۔ خود تو مزے کر رہے ہو اور ہمیں جھوٹے منھ بھی نہیں پوچھتے۔؟ معلوم ہے مہنگائی کتنی بڑھ چکی ہے۔''

''وہ کیا ہے صاحب جی۔ کمل جتنی بھیگے گی اُتنی ہی بھاری ہوگی نا۔ آجکل لوگ کیا کرتے ہیں کہ چادر دیکھے بنا ہی پاوں پھیلاتے ہیں۔ وہ یہ سوچ کر بیٹھے رہتے ہیں کہ انڈے سیوے بی فاختہ اور کوے بچے کھائیں۔ ایسا نہیں ہوتا ہے صاحب جی۔ مزے کرنے ہیں تو خود محنت کرو۔ اُڑتے بادل دیکھ کر گھڑے لے کر مت دوڑو۔''

یہ جواب سن کر میری تو بولتی ہی بند ہوگئی۔ موسم جاڑے کا تھا۔ اچھی خاصی ٹھنڈ تھی پر اُس کی باتیں سن کر مجھے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ وہ تو درس خوان کی طرح مجھے اونچ نیچ سمجھانے بیٹھ گیا یہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ اُس وقت میں آفس میں اکیلا تھا۔ اس سے پہلے کہ ماتحتوں کے سامنے میری کرکری ہو جائے میں نے اپنی جان چھڑانے کے لئے اُسے وہاں سے چلتا کر دیا۔ اُس کے جانے کے بعد میں اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ مجھے اس سنکی سے یہ سب کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو اتنا اکڑو اور منھ پھٹ تھا کہ کسی کو بھی لتے لے سکتا تھا جبھی تو سارے افسر اُس سے دور دور ہی بھاگتے تھے۔ وہ تو کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں تھا اسلئے کوئی اُس سے کچھ مانگتا نہیں تھا۔ ایسے ننگ، نیستی سے کوئی کیا مانگے جو خود ہی محتاج ہو۔ جتنا کماتا تھا اُس سے کہیں زیادہ دارو اور عیاشی میں نکل جاتا تھا ایسے میں چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں بچا رہے گا۔ وہ دونوں جس حال میں بھی ہوں رہتے تھے بڑے ٹھاٹ سے۔ ڈیوٹی پر ان دونوں کی من مانی چلتی رہتی تھی۔ جب اُنکا موڑ ہوگا تو وہ پھیرہ دے کے آئیں گے نہیں تو گاڑی ایسی ہی کھڑی رہے گی۔ انکی من مانی دیکھ کر بھی کوئی اُن سے کچھ کہتا نہیں تھا۔ دراصل ہر افسر کو اپنی عزت و آبرو پیاری تھی۔ یہ دونوں ٹھہرے بے حیا اور بے شرم۔ جس نے اُتار دی ہو لوئی اُس کا کیا کرے گا کوئی اسلئے ہر کوئی ان سے فاصلہ بنائے رکھتا تھا۔۔ یہ اپنی اس دادا گری کا بھرپور فائدہ اُٹھاتے تھے اور جب بھی پھیرہ لگانے نکلتے تھے تو ایک ساتھ۔ یہ تو طے تھا کہ کوئی بھی افسر اُنہیں الگ الگ روٹ پر بھیجنے کی کبھی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔

جب یہ دونوں جموں کے پھیرے پر نکل جاتے تھے تو انکے کلینر منھ اندھیرے ہی ٹرک کے پاس پہونچ جاتے تھے۔ جب تک یہ دونوں نہیں آتے تھے وہ ٹرک میں تیل پانی بھروا کے رکھتے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized By eGangotri

تھے۔ وہ دونوں جونہی آجاتے تو ٹرک لے کر سیدھے نکل جاتے تھے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ ایک ٹرک کے پیچھے دوسرا ٹرک رکھتے تھے۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا تھا کہ اگر راستے میں کوئی مشکل آن پڑی یا ٹرک میں کوئی خرابی آگئی تو دوسرا مدد کے لئے تیار کھڑا ہے وہ دن بھر چلتے ہی رہتے تھے اور شام کو جب بٹوت پہونچ جاتے تھے تو ٹرک بازار سے پہلے کھڑا کر کے وہ لنگر ڈالتے تھے۔ ٹرک میں کھانا پکانے کا ہر سامان موجود رہتا تھا۔ دونوں کلینر ٹرک کے اگل بغل میں ہی اسٹو گرم کر کے کھانا پکاتے تھے۔ جب تک کھانا پک کر تیار ہوتا تھا گل چرسی اور کاشی وسکی دارو کی بوتل سے دل لگی کرنے لگتے تھے۔ گل چرسی کے ساتھ مسلہ یہ تھا کہ وہ جونہی چار پیگ سے تجاوز کر جاتا تھا تو وہ اول جلول بکنے لگتا تھا جب کہ کاشی وسکی چھ سات پیگ انڈیلنے کے بعد بھی چپ کی مورت بنا رہتا تھا۔ آٹھ پیگ کے بعد وہ اپنی بیوی کو یاد کر کے رونے لگتا تھا۔ یوں بکتے جھکتے اور روتے دھوتے آدھی رات بیت جاتی تھی۔ ان کے کلینروں کو انہیں کھانا کھلانے میں بڑی مشقت کرنی پڑتی تھی۔ ایک کو اُٹھانے لگتے تھے تو دوسرا چت ہو جاتا تھا۔ وہ بھی نہ جانے کس مٹی کے بنے ہوئے تھے کہ اس سیوا ٹہل کے بدلے اُنہیں گالی گفتار سے نوازا جاتا تھا پھر بھی وہ اپنے فرض سے منہ نہیں موڑتے تھے۔ اُن کے منہ میں تب تک اناج کا ایک دانہ نہیں جاتا تھا جب تک وہ اپنے اُستادوں کو کھانا نہیں کھلا دیتے تھے۔ وہ ان کی اس بے غرض اور بے لوث خدمت سے غافل نہ تھے۔ وہ دونوں انہیں اپنے بچوں کی طرح پیار کرتے تھے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ گل چرسی کا کلینر کشن لال تھا جب کہ کاشی وسکی کے کلینر کا نام علی قبائلی تھا۔ اس بے میل کے جوڑ میں بھی ایک الگ ہی نشہ تھا۔

گو کہ دونوں نشے باز تھے پر دونوں بڑے ہی توہم پرست، تنگ نظر اور پرہیز گار تھے۔ یہ پرہیز گوشت تک ہی محدود تھی۔ کاشی وسکی کے سامنے اگر کوئی بڑے گوشت کا نام بھی لیتا تھا تو وہ جا کر گنگا جل سے اپنا منہ دھو لیتا تھا۔ یہی حال گل چرسی کا تھا وہ جھٹکے کے نام سے ہی بدکنے لگتا تھا۔ اگر اُسے بہ سبب مجبوری ہندو ڈھابے میں کھانا کھانا پڑتا تھا تو وہ پہلے خود کچن میں جا کر اس بات کی تسلی کرتا تھا کہ اس ڈھابے میں گوشت نہیں پک رہا ہے۔ اگر ہندو ڈھابے میں حلال کا گوشت بھی پکا ہو تب بھی وہ ڈھابے کا بنا گوشت کبھی نہیں کھاتا تھا۔ اس بات کو لے کے دونوں میں بڑی لمبی بحث و تکرار ہوتی تھی۔ گل چرسی کا ایک ہی جواب ہوتا تھا۔ مذہب میں جھٹکا کھانا حرام ہے اسلئے وہ بھوکوں مرنا پسند کرے گا مگر کبھی بھی جھٹکا نہیں کھائے گا۔ کاشی وسکی بھی بڑے گوشت کے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بارے میں ایسا ہی نظریہ رکھتا تھا۔

جنوری کا مہینہ تھا۔ گل چرسی اور کاشی وسکی کے ٹرک پچھلے چار دن سے یارڑ میں منہ اُٹھائے کھڑے تھے۔ دونوں ٹرکوں میں سوپور کے ڈیلی شیس سیبوں کی پیٹیاں بھری پڑی تھیں۔ چونکہ وادی میں برفباری ہوئی تھی اسلئے سری نگر جموں شاہراہ کچھ دنوں سے بند پڑا تھا۔ وہ صبح سویرے ہی یارڑ میں پہونچ جایا کرتے تھے جب وہاں اُنہیں راستہ بند ہونے کی خبر ملتی تھی تو دونوں کے چہرے لٹک جاتے تھے اور وہ مایوس ہو کے لال چوک کی طرف چل پڑتے تھے۔ وقت گزاری کے لئے وہ دن میں پلیڈیم سینما میں بیٹھ کر کوئی فلم دیکھتے۔ اُس کے بعد وہ تب تک یونہی مٹر گشتی کرتے رہتے جب تک کہ جھٹپٹے کا وقت نہیں ہوتا تھا۔ ایک بار آفتاب غروب ہو جاتا تھا اور شام کا ارغوانی آنچل فضا میں لہرانے لگتا تھا تو وہ رتن لال کے ڈھابے میں گھس جاتے تھے۔ رتن لال امرتسر کا رہنے والا تھا اور پچھلے کئی دہائیوں سے ''رتن ویشنو ڈھابہ'' چلاتا تھا۔ رتن لال کے زیادہ تر گراہک محکمہ ٹرانسپورٹ کے ڈرائیور کلینر یا پلیڈیم سینما کے بلیکر ہوا کرتے تھے۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ رتن لال بڑا زندہ دل اور یار باش آدمی تھا وہ اپنی خوش اخلاقی سے دشمن کو بھی اپنا دوست بنا لیتا تھا۔ ڈرائیوروں کی فطرت سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ سرکاری ٹھیکے کی دوکان اُس کے ڈھابے سے دو کوس کے فاصلے پر تھی۔ وہ ہمیشہ ٹھرے کی دو تین بوتلیں منگوا کے رکھتا تھا۔ اگر کسی کے پاس پینے کے لئے پیسے نہ ہوں تو وہ اپنے سٹاک میں سے اُسے پلا دیتا تھا۔ اُس کی اس فراخ دلی نے اُسے شرابیوں کا محبوب بنا دیا تھا۔ وہ اُس کی یاری دلداری کی قسمیں کھایا کرتے تھے۔

گل چرسی اور کاشی وسکی اُس کے بہت پرانے گاہک تھے جو جب ڈیوٹی سے فارغ ہوتے تو سیدھے ڈھابے کا رخ کر لیتے تھے۔ چنانچہ یہاں اُنہیں سوڑا پانی ہی نہیں بلکہ چکھنے کے لئے مولی یا پیاز کی چٹنی بھی مفت میں مہیا کی جاتی تھی اسلئے وہ یہیں بیٹھنا پسند کرتے تھے۔ دیر ہو جائے تو وہ کھانا بھی یہیں کھا لیا کرتے تھے۔ دیسی گھی کا تڑکا لگی دال، سبزی اور چاول اُنکا من بھاتا کھانا ہوا کرتا تھا۔ اُس دن بھی وہ رات گئے تک پیتے رہے۔ جب نشہ حاوی ہونے لگا تو اُنہوں نے دو دو روٹیاں زہر مار کر کے کھا لیں۔ رتن لال کا بل چکا کے جب وہ اُٹھنے لگے تو دونوں کے پاوں ڈگمگانے لگے۔ دونوں پوری طرح نشے میں غین تھے۔ پورے شہر میں جیسے ہو کا عالم طاری تھا۔ ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ دونوں کچھوے کی چال کی مانند آگے بڑھتے جا رہے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

تھے۔ ایک کلومیٹر کا سفر اُنہیں ہمالیہ کو سر کرنے جیسا لگ رہا تھا۔ وہ جونہی بڈشاہ چوک سے آگے بڑھنے لگے تو شہر کے آوارہ کتوں نے اُن پر ہلہ بول دیا۔ کسی نے جھپٹ کر اُنکے کپڑے نوچے۔ کوئی ہڑ بڑا کر گرا۔ وہ بڑی مشکل سے ان آوارہ کتوں سے جان چھڑا کر آگے بڑھتے چلے گئے۔ اُن کی حالت دیکھنے کے لائق تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ دونوں جنگ کے مورچے سے ابھی ابھی لوٹے ہوں۔ وہ گرتے پڑتے کاذب صبح نمودار ہوتے ہوتے اپنے محلے میں وارد ہوئے۔ جونہی وہ گاو کدل کے چوک میں پہونچے تبھی ولی محمد کے مرغے کی بانگ سنائی دی۔ اُس کی بانگ کے فوراً بعد مسجد سے موذن کی اذان گونجی۔ پہلے بانگ اور پھر اذان سن کر گل چرسی کی باچھیں کھل گئیں اور وہ زور زور سے اللہ اکبر کا ورد کرنے لگا۔ کاشی وسکی اسکا یہ روپ دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ اچانک وہ رکا اور کاشی وسکی کی طرف مڑ کر سرشاری کے عالم میں اُس سے سوال کر بیٹھا ''تم نے مرغے کی بانگ سنی؟''

''ہاں سنی۔'' وہ بڑی بے پروائی سے بولا۔

''مرغے کی بانگ کے ساتھ ہی تم نے اذان سنی۔'' گل چرسی نے مضطرب ہو کے پوچھا۔

''ہاں سنی۔'' کاشی وسکی زچ ہو کے بولا۔ ''اس میں ایسی کیا خاص بات ہے جو تم اس طرح اُچھلنے لگے ہو۔؟''

''خاص بات ہے۔ بہت ہی خاص بات ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ مرغا مسلمان ہے اسی لئے تو اسنے موذن کو یاد دلانے کے لئے بانگ دی۔''

''ہٹ!'' کاشی وسکی چڑ کر بولا۔ ''جانوروں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے۔''

''ہوتا ہے۔ ہوتا ہے۔'' گل چرسی اپنی بات پر اڑ گیا۔ ''میں دعوی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ مرغا مسلمان ہے۔ اُسے اذان کا وقت معلوم ہے''

دونوں اس بحث کو لے کے اُلجھ پڑے۔ بات اتنی بڑھی کہ وہ گالی گفتار پر اُتر آئے۔ اتنے میں نمازی گھروں سے باہر آنے لگے اُنہوں نے جب ان دونوں کو نشے کی حالت میں دیکھا تو پہلے وہ اچنبھے میں رہ گئے پھر اُن کی خوب سرزنش کی۔ حالانکہ ان دونوں نے بے غیرتی کا ٹھیکرا آنکھوں پر رکھ لیا تھا اسلئے لعنت ملامت ہونے کے باوجود وہ بہت دیر تک محاذ پر ڈٹے رہے۔ جب نمازیوں کی تعداد بڑھنے لگی اور

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اُنہیں ہر طرف سے پھٹکار پڑنے لگی تو وہ دم دبا کر وہاں سے بھاگ گئے اور اپنے اپنے گھر پہونچ کر اسطرح اوندھے پڑ گئے کہ دن کے بارہ بجے تک اُنہیں ہوش ہی نہیں رہا۔

دو بجے وہ پھر اسی چوک میں ملے جہاں وہ روز ملا کرتے تھے۔ اس بار وہ بنا کسی علیک سلیک کے سیدھے ٹرانسپورٹ یارڑ کی طرف بڑھنے لگے۔ راستے میں وہ دونوں بالکل خاموش رہے جیسے چپ شاہ کا روزہ رکھ لیا ہو۔ یارڑ میں پہونچے تو وہاں بھی کوئی خوش کن خبر نہ ملی۔ وہاں سے مایوس اور دل برداشتہ ہو کر اُن کے قدم خود بخود لال چوک کی طرف بڑھنے لگے۔ اس بار وہ فلم دیکھنے نہیں گئے بلکہ سیدھے رتن لال کے ڈھابے میں گھس گئے۔ انہیں صبح صبح دیکھ کر رتن لال بھی حیران رہ گیا۔ گل چرسی نے جیب سے سو کا نوٹ نکال کر ایک لڑکے سے دیسی دارو کی ایک بوتل منگائی اور پھر وہ دونوں بیٹھ کر پینے لگے۔ دراصل گل چرسی کے دل و دماغ میں اب تک ایک ہی سوال کلبلا رہا تھا۔ ایک دو پیگ حلق کے نیچے اُتارنے کے بعد اُسنے مرغے کی بحث پھر سے چھیڑ دی۔ کاشی وسکی مرغے کے نام سے ہی برافروختہ ہو اُٹھا۔ وہ گل چرسی کی طرف خشم سے دیکھ کر بولا۔ ''کیوں اُس بدبخت مرغے کو لے کر تم میرے موڑ کی ایسی تیسی کرنا چاہتے ہو؟''

کاشی وسکی نے مرغے کو بدبخت کیا کہا کہ گل چرسی ہتھے سے اُکھڑ گیا اور طیش میں آ کر اُس نے اپنا گلاس زمین پر دے مارا اور چلاتے ہوئے بولا۔

''تم نے اُس پرہیزگار مرغے کو گالی دی؟ یہ تم نے اچھا نہیں کیا کاشی۔ یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔''

دیکھتے ہی دیکھتے بات اتنی بڑھی کہ وہ ایک دوسرے سے دست گریبان ہونے لگے۔ اس سے پہلے کہ بات حد سے بڑھ جائے، رتن لال بھاگ کر آیا اور وہ دونوں کو سمجھاتے ہوئے بولا۔

''ارے ارے۔ یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ۔ کیوں ذرا سی بات کا بھتنگڑ بنانا چاہتے ہو۔ اس طرح آپس میں لڑنے بیٹھ جاؤ گے تو لوگ کیا کہیں گے۔ تم دونوں اتنے پرانے یار غار ہو۔ کوئی بات ہے تو اُسے مل بیٹھ کر سلجھا لو نا۔ اس طرح سب کے سامنے اپنا تماشہ کیوں بنانا چاہتے ہو۔''

رتن لال کی بروقت مداخلت نے ان دونوں کو دست گریبان ہونے سے روک لیا۔ طے یہ پایا گیا کہ یہاں سے نکل کر وہ سیدھے مرغی فروش ولی محمد کے پاس جائیں گے جو کہ اُس مرغے کا مالک ہے اور اُسی سے اس بات کی تصدیق کرائیں گے کہ آیا یہ مرغا مسلمان ہے کہ نہیں۔ طوعاً و کرہاً کاشی کو اس فیصلے سے صاد کرنا پڑا شام کا وقت تھا۔ ولی محمد دوکان بند کرنے والا ہی تھا کہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

دونوں آدھمکے۔ ولی محمد بھی اسی محلے میں رہتا تھا اور ان دونوں کو اچھی طرح جانتا تھا اسلئے جب اُسنے ان دونوں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ ترت پھرت دوکان بند کرنے لگا کہ گل چرسی بیچ میں کھڑا ہو گیا اور قدرے بیزاری سے بولا۔

''ارے تم اس طرح ہوا کے گھوڑے پر سوار کیوں ہو۔ ذرا رکو تو سہی۔ مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔''

''میری طبیعت ذرا ٹھیک نہیں ہے اسلئے دوکان بند کر کے گھر جا رہا ہوں۔'' وہ مسکین سی صورت بنا کے بولا۔

''گھر جانا چاہتے ہو تو شوق سے جاو نا۔ کوئی نہیں روکے گا تمہیں۔ ہمیں بس اتنا بتا دو کہ وہ جو بانگی مرغا تمہارے پاس ہے وہ کہاں ہے''

''وہ مرغا تو میں نے آج ہی بیچ ڈالا۔'' ولی محمد بڑے اطمینان سے بولا۔

''کیا'' گل چرسی تیورا کر دھم سے نیچے بیٹھ گیا۔ ''کس کے ہاتھ بیچ دیا تو نے اُسے؟''

''وہ پپو سنگھ ہے نا جو کورٹ روڑ پر فرئی مچھلی اور چکن کی ریڑھی لگاتا ہے وہی اُس مرغے کو خرید کر لے گیا۔''

گل چرسی کو لگا جیسے کسی نے اُس کے سینے پر وزنی گھونسا مارا ہو۔ وہ چکرا کر نیچے بیٹھ گیا اور پھر اپنا سر تھام کر سیاپا کرنے والے انداز میں بولا۔

''ہائے رے ظالم۔ یہ تو نے کیا کیا۔ ایک پرہیز گار مرغے کو ایک کافر کے ہاتھ بیچ دیا۔ اُس کمبخت نے اُس مظلوم کو ایک جھٹکے میں مار ڈالا ہوگا۔'' یہ کہکر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ولی محمد صم بکم بنا رہا۔ بہت دیر تک اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ گل چرسی اُس کے مرغے کے لئے اتنا دکھی اور پریشان کیوں ہے۔ اُسنے اس موضوع کے پیچھے زیادہ مغز پچی کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اُسنے جلدی سے دوکان بڑھالی اور وہاں سے سر پر پاوں رکھ کر بھاگا۔ گل چرسی بلک بلک کر روتا رہا اور کاشی وسکی اُس کے پاس سوگوار کی طرح بیٹھا رہا۔ وہ چھاتی پیٹ پیٹ کر کہہ رہا تھا۔ ''اُس ظالم پپو سنگھ نے اُسے جھٹکا کرنے سے پہلے ایک گھونٹ پانی بھی نہ پلایا ہوگا۔'' وہ کاشی کی طرف مڑا اور سسکتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں ابھی پپو سنگھ کے پاس چلنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ ابھی اُس نے اُس مرغے کو ذبح نہ کیا ہو۔''

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کاشی وسکی کچھ نہ بولا۔ چپ چاپ گل چرسی کے پیچھے ہولیا۔ وہ دونوں بھاگتے ہوئے پپو سنگھ کے پاس پہونچ گئے۔ ریڑھی پر مسالے لگے مرغے دیکھ کر گل چرسی کا کلیجہ پھٹا جانے لگا۔ وہ جارحانہ انداز سے پپو سنگھ کی طرف دیکھ کر چلایا۔ ''اوئے سردارا، ظالما مار ڈالا تو نے میرے بانگی مرغے کو؟''

''پرا جی میں مرغے نہیں ماروں گا تو کیا مکھیاں ں ماروں گا۔ مرغے بیچنا تو میرا دھندہ ہے۔ آپ بولو کیا چاہے آپ کو؟''

''اوئے تف ہو تمہاری اوقات پر۔ تو کیا دے گا مجھے۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ وہ بانگی مرغا کہاں ہے جسے تم ولی محمد سے خرید کر لائے ہو۔؟''

''وہ مرغا؟'' پپو سنگھ کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور وہ فخریہ انداز میں بولا۔ ''او جی وہ مرغا تو بڑے کمال کا ہے۔ سویرے سویرے جب میں سو رہا تھا تو وہ میرے کمرے میں آ کر بانگ دینے لگا۔ اوئے مالکو مزے کی بات سنو۔ اُس کے بانگ دینے کی دیر تھی کہ بغل والے گوردوارے سے گورو گرنتھ صاحب کا پاٹھ شروع ہوا۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ مرغا سکھ ہے جبھی تو اُسنے گرنتھ صاحب کا پاٹھ شروع ہونے سے پہلے ہی بانگ دے دی۔''

پپو سنگھ کی بات سن کر کاشی وسکی نے گل چرسی کی طرف دیکھا۔ اُس کا منھ تو جیسے ہوا میں لٹک کے رہ گیا تھا۔ اُسنے گل چرسی کا ہاتھ تھاما اور پھر وہ دونوں رتن لال کے ڈھابے کی طرف بوجھل قدموں کے ساتھ بڑھے۔ گل چرسی ابھی تک کاشی وسکی سے آنکھیں نہیں ملا پا رہا تھا۔

■ ■ ■

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

مچھی والی

سری نگر میں مچھلیوں کا کوئی مخصوص مارکیٹ نہیں ہے۔ یہاں مچھلیاں یا تو براہ راست آپ کے دروازے تک پہونچتی ہیں یا دریائے جہلم پر بنے پل جیسے امیرا کدل پل، بڈشاہ پل، حبہ کدل پل یا زینہ کدل پل پر سے دستیاب ہوسکتی ہیں۔ ان پلوں کے فٹ پاتھوں پر مچھی والیوں نے برسوں سے قبضہ جما کے رکھا ہے۔ حکومتیں بدلیں۔ حالات بدلے۔ پل بدلے۔ پرانے پلوں کی جگہہ نئے پل تعمیر ہوئے۔ اتنا سب کچھ بدلنے کے باوجود مچھلیوں کے یہ بازار نہیں بدلے۔ کتنے ہی میونسپلٹی کے افسروں نے ان مچھی والیوں کو یہاں سے کھدیڈنے کی کوشش کی مگر کسی کو کامیابی نہیں ملی۔ ان مچھی والیوں نے ان پلوں کے فٹ پاتھوں کو اپنے باپ دادا کی جاگیر کی طرح ان پر قبضہ جمالیا تھا۔ کس کی کیا مجال جو وہ ان مچھلی والیوں کی طرف آنکھ بھی ٹیڑھی کر سکے۔ اب اگر کسی جیالے پولیس والے یا کسی افسر نے ان کو دانت دکھانیکی کوشش کی تو اُسے منہ کی کھانی پڑی۔ کیونکہ یہ مچھی والیاں اتنی منہ پھٹ اور جھگڑالو تھیں کہ شیطان بھی ان سے پناہ مانگتا تھا۔ کسی نے ایک سنائی نہیں تو وہ کھڑے کھڑے سو سونا کر بیٹھ جاتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ کوئی انکے منہ لگنا نہیں چاہتا تھا۔ فٹ پاتھ پر اُنکے یوں بازار لگانے سے حالانکہ راہ چلتے مسافروں کو پل پار کرنے میں بڑی دقت ہوتی تھی۔ اُنہوں نے فٹ پاتھ کو یوں گھیر کے رکھا تھا کہ راہ گیر کو ایسے نکلنا پڑتا تھا جیسے سوئی کے ناکے سے نکلنے کی سعی کر رہا ہو۔ مگر اتنی تکلیف اُٹھانے کے باوجود کوئی انکے خلاف زبان نہیں کھولتا تھا۔ اُنہوں نے ہر پل کو پل صراط سمجھ کر پار کرنا قبول کر لیا تھا مگر مچھی والیوں سے دشمنی مول لینا منظور نہ تھا۔

آخر پلوں کی اور مچھلی والیوں کی اس قربت کی وجہ کیا تھی یہ تو کوئی محقق ہی بتا سکتا ہے یا امیرا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کدل کے فٹ پاتھ پر بیٹھنے والی وہ چار مچھی والیاں جو ہر دن اس پل پر ایک قطار میں بیٹھی ہوئی نظر آتی تھیں۔ اُن کی اپنی اپنی جگہہ مخصوص تھی۔ کسی ادلا بدلی کا امکان کم ہی ہوتا تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ مچھلیاں بیچنے کیلئے عورتیں ہی یہاں آکر بیٹھ جایا کرتی تھیں۔ آج تک میں نے کسی مرد مچھی والے کو یہاں بیٹھے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہ عورتیں مختلف علاقوں کی رہنے والی تھیں۔ کوئی زکورہ کی ہے تو کوئی نشاط یا ہارون کی رہنے والی۔ یہ چاروں صبح صبح مال لے کر امیرا کدل پہونچ جایا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی صبح کی نشت میں ہی سارا مال بک جاتا تھا۔ کبھی پورا مال نہ بکنے کی صورت میں شام کو بھی انہیں قسمت آزمائی کرنی پڑتی تھی۔ یہ جو چار مچھی والیاں تھیں اسمیں سے حبلہ اور کلسم ادھیڑ عمر کی تھیں، جب کہ سارہ اور مریم درمیانہ عمر کی تھیں۔ حالانکہ ان کی آپس میں کوئی قرابت داری نہ تھی۔ چاروں مختلف خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں مگر یہاں آکر وہ بہنوں کی طرح ایک دوسرے کو اپنے دکھڑے سنانے بیٹھ جاتی تھیں۔ حبلہ کلسم اور سارہ کی آپس میں خوب چھنتی تھی جب کہ مریم سے انکی بنتی نہیں تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ ان چاروں میں سب سے زیادہ خوبصورت اور خوش باش مریم تھی۔ وہ عام مچھلی والیوں کی طرح نہیں تھی۔ وہ بڑی نزاکت پسند اور خوش طبع تھی۔ وہ ایسے عشوے اور غمزے دکھاتی تھی کہ گاہک اُس کی ایک ایک ادا پر فدا ہو کر رہ جاتے تھے اور ہمیشہ اُسی سے مچھلیاں خرید کر لے جاتے تھے۔ چاہے اُس کی مچھلیاں سڑی ہوئی کیوں نہ ہوں، وہ دیکھتے ہی دیکھتے مچھلیوں سے بھرا ہوا باسن خالی کر دیتی تھی جب کہ اُس کی ہم پیشہ عورتوں کا ہنکارے لگاتے لگاتے دم پھول جاتا تھا پر اُنکی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ اُس کے وہاں سے چلے جانے کے بعد ہی چند بھولے بھٹکے گاہک اُنکی گرفت میں آجاتے تھے۔ وہ اتنی آزردہ اور دل جلی ہوتی تھیں کہ جتنا مال بیچتی نہیں تھیں اُس سے کہیں زیادہ مریم کو کوسنے دیتی رہتی تھیں۔

کسی بھی مال کو بیچنے کے لئے ایک خاص ادا اور انداز چاہیے۔ ایک مریم کو چھوڑ کے باقی کی یہ مچھی والیاں اُس ادا سے نابلد تھیں۔ دراصل وہ ان پڑھ اور گنوار تھیں۔ نہ بات کرنے کا سلیقہ نہ لبھانے کی ادا معلوم، شکل وصورت دیکھو تو سر جھاڑ منہ پہاڑ۔ کپڑے ایسے پہن کے رکھے ہیں جن میں لیرے لگے ہیں۔ حالت یہ اور اینٹھ ایسی کہ ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیں۔ مطلب یہ کہ شکلیں چڑیلوں کیں اور مزاج پریوں کا۔ جب بھی کوئی گاہک اُنکے سامنے کھڑا ہو کر اُن کی طرف دیکھنے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

لگتا تھا تو وہ اُسے ایسی خشم ناک نگاہوں سے گھورنے لگتی تھیں جیسے وہ اُنہیں اغوا کرنے آیا ہو۔ اُنکے چہرے مہرے سے وحشت ٹپکتی تھی۔ ایسے میں گاہک کی آدھی دلچسپی انکا سڑا اور جلا ہوا منھ دیکھ کے ہی ختم ہو جاتی تھی۔ ایک تو وہ جھگڑالو اوپر سے ہٹیلی۔ گاہک کو خوش کرنے کے لئے ریٹ میں کمی پیشی کرنی ہی پڑتی ہے مگر وہ تو ایک دمڑی کم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی تھیں۔ کوئی ریٹ کم کرنے کے لئے کہتا تو وہ ایسے بگڑ جاتی تھیں جیسے گاہک نے ان کو کوئی مادر زاد گالی دی ہو۔ کوئی اُنہیں اپنے طور طریقے بدلنے کا مشورہ دیتا تو وہ اُسے ہی آڑے ہاتھوں لینے لگتی تھیں۔ اُن کو سمجھانا اپنا سر پتھر پر دے مارنا جیسا تھا۔ وہ تو جیسے یہ طے کر کے بیٹھیں تھیں کہ چاہو تم کاٹو اپنی ناک کانی میں نہ چھوڑوں اپنی بانی۔ جو گاہک غلطی سے اُنکے چنگل میں پھنس جاتا تھا وہ تو ایک بار ان سے مال لے کر آگے کے لئے توبہ کر لیتا تھا۔ وہ مال بھی ایسے دیتی تھیں جیسے گاہک پر احسان کر رہی ہوں۔ اُنکے اس طریقہ کار سے گاہک اُن سے دور دور ہی بھاگتے تھے جب کہ مریم کے آگے گاہکوں کی لائن لگی رہتی تھی۔ مریم کے آگے پیچھے کتنے بھی گاہک آ کے کھڑے ہو جاتے تھے وہ ایک شوخ تبسم کے ساتھ اپنے ہر گاہک کا سواگت کرتی تھی۔ گاہک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ بڑے پیار سے جو اُس سے بات کرتی تھی تو خریدار ایک دم ریشہ خطمی ہو کر رہ جاتا تھا اور پھر مریم کے آگے وہ یوں پھسکڑا مار کر بیٹھا رہتا تھا جیسے اُسنے اُس پر کالا جادو کر دیا ہو۔ اُس کی ساتھ والیاں تازہ مال لے کے خریداروں کی راہ تکا کرتی تھیں جب کہ مریم اُبسی ہوئی مچھلیاں بھی من موافق دام پر بیچا کرتی تھی۔

مریم اپنی ساتھ والیوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ وہ اُسے اُٹھتے بیٹھتے پانی پی پی کر کوسا کرتی تھیں۔ اُس کی وجہ سے اُنکا دھندہ ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا۔ کلسم کا شوہر پیر مرشد تھا۔ قرب و جوار کی عورتیں آ کر اُس سے تعویذ لیا کرتی تھیں۔ کلسم ایک روز اپنے میاں سے گنڈے تعویذ لے کر آئی۔ ہفتوں بیت گئے۔ مریم پر تو کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔ اُس پر تو جیسے کسی شیطان کا سایہ تھا۔ کسی چیز کا اُس پر کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ تو ہر روز اس اُمید کے ساتھ اُٹھتی تھیں کہ آج مریم اس بازار سے دفا ہو جائے گی مگر وہ تو اپنی جگہ جمی ہوئی اُن کی چھاتی پر مونگ دلتی رہتی تھی۔ جب پیر فقیروں کی کوششیں کارآمد ثابت نہ ہوئیں تو اُنہوں نے دوسرا راستہ اپنا لیا، حبلہ کا خصم شیر گڑھی تھانے میں خاکروب تھا۔ حبلہ نے اُسے مریم کے پیچھے لگا دیا۔ وہ پولیس کی وردی پہن کر

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

آیا تو تھا مریم کو اپنا رعب دکھانے پر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اُلٹی آنتیں گلے پڑ جائیں گے۔ وہ تو اپنی نوکری سے ہی ہاتھ دھو بیٹھا۔ ہوا یوں کہ ایس پی صاحب کی بیوی مریم سے ہی مچھلیاں خرید کر لے جاتی تھی۔ جب پولیس والے نے مریم کا قافیہ تنگ کرنا شروع کر دیا تو وہ دوڑی دوڑی میم صاحب کے پاس گئی اور جا کر پولیس والے کی شکایت کر دی۔ معاملہ ایس پی کی نوٹس میں آ گیا۔ سلام شیخ کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ اُسے نوکری سے برطرف کر دیا گیا۔ وہ اپنی بیوی کو تبرہ بھیجتا رہا۔ حبلہ اپنا سر پیٹتی رہ گئی۔ اُس دن کے بعد مریم اُنکی آنکھوں کی شہتیر بن کے رہ گئی۔ اُس کی خوشحالی اُن سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ اُس کی کامیابی سے جلتی تھیں۔ وہ جب اپنا باسن خالی کر کے اُٹھ کر چلی جاتی تھی تو وہ جل بھن کر کوئلہ ہو جاتی تھیں۔ وہ جب نوٹ گننے بیٹھ جاتی تھی تو نوٹ دیکھ کر اُنکے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے تھے۔ وہ جب کسی سے ہنسنے بولنے لگتی تھی تو وہ کان لگا کر ان دونوں کی باتیں سننے لگتی تھیں تا کہ انکے ہاتھ کوئی ایسا بہانہ تو مل جائے تا کہ وہ مریم کو پورے بازار میں ذلیل و رسوا کر سکیں۔ اُس کا بن ٹھن کے رہنا بھی اُنہیں گوارہ نہ تھا۔ ادھیڑ عمر کی حبلہ اپنی ہم عمر عورت کلسم سے کہتی:

''بے حیا، چھنال سج دھج کے کیسے آئی ہے جیسے دوسرا خصم کرنے نکلی ہو۔''

''ہائے ہائے بے شرمی کی بھی حد ہو گئی۔ میں تو اسے اللہ میاں کی گائے سمجھتی تھی مگر یہ تو شیطان کی خالہ نکلی۔ اسکا اُبھرا ہوا پیٹ دیکھ رہی ہو کیا۔ مجھے لگتا ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ کہتی ہے میں نے خصم کر لیا ہے پر وہ ہے کہاں۔ آج تک وہ ہم میں سے کسی کو دکھائی نہ دیا۔ ہوتا تو کیا وہ کبھی اس طرف نکل نہ آتا۔ یہ ہم سب کو اُلو بنا رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ ہم سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کوئی اور ہی کھیل کھیل رہی ہے۔ یہ مچھلی بیچنا، مجھے تو یہ سب ڈھول کا پول ہی لگ رہا ہے۔''

''تم سچ کہہ رہی ہو بہن مجھے بھی معاملہ کچھ گڑ بڑ لگ رہا ہے۔ یہ عورت بڑی چالاک اور مکار ہے۔ وہ کہتے ہیں نا سب گنوں پوری کہو نہ لنڈوری ویسی ہی ہے یہ بدذات'' وہ اسی طرح آئے دن پیٹھ پیچھے اُس کی غیبت کرتی رہتی تھیں۔ مریم کا ان باتوں سے کچھ بگڑ نہیں رہا تھا۔ وہ تو ان ساری باتوں سے بے خبر اپنے کام سے کام رکھتی تھی جب کہ یہ تین عورتیں اُس کی برائی کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالی کرتی تھیں۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

مریم کی ذاتی زندگی کے بارے میں اُس کی ہم پیشہ عورتیں اتنا ہی جانتی تھیں کہ پہلے اُس کی ماں یہاں پر بیٹھ کر مچھلیاں بیچا کرتی تھیں۔ مرنے سے پہلے وہ اس پیشے کو اپنی بیٹی کو ودیعت کر گئی۔ پھر پتہ چلا کہ مریم کی شادی ہوگئی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ حبہ کدل میں کہیں رہ رہی ہے۔ شادی کے بعد وہ اچانک غائب ہوگئی اور ایک سال تک اس بازار میں دکھائی نہ دی۔ اُس کے چلے جانے پر اُس کی ہم پیشہ عورتوں نے گھی کے چراغ جلائے۔ پاس کے آستانے میں جا کر حاضری دی اور سب نے باری باری نیاز چڑھالیا۔ اب وہ اس بازار کی بے تاج ملکائیں تھیں۔ گاہک کو اب جبراً وقہراً انہی سے مچھلیاں خریدنی پڑتی تھی۔ کوئی اگر مریم کے بارے میں پوچھتا تھا تو وہ ہتھے سے اُکھڑ جاتیں اور پھر برافروختہ ہو کر اُس سے پوچھتی۔

''کیوں تو اُس کا خصم ہے کیا؟''

گاہک اس جواب سے اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا تھا۔

مریم کے چلے جانے کے بعد اب ان تینوں کے دن پھر گئے تھے۔ اب وہ مچھلیاں منہ مانگے داموں پر بیچا کرتی تھیں۔ مال بھی جلدی جلدی ختم ہو جاتا تھا۔

فارغ ہوتے ہی وہ آپس میں ہنسی ٹھٹھول کرنے بیٹھ جاتی تھیں۔

''ہائے جب سے وہ منحوس یہاں سے گئی ہے بازار میں جیسے رونق آ گئی ہے۔ وہ جب تک یہاں تھی ہم پر جیسے نحوست چھائی ہوئی تھی۔ خریدار ہمیں دیکھ کر ایسے منہ پھیر لیتا تھا جیسے ہم اُسے کھا جائیں گے۔ بس اُسی چھنال کے پاس مرنے جائے گا۔ وہ گئی تو ایسا لگ رہا ہے جیسے خس کم جہاں پاک ہوگیا۔''

''مجھے تو شک ہے کہ وہ جادو ٹونا کرنا جانتی تھی۔ نہیں تو اُسمیں ایسے کونسے سرخاب کے پر لگے تھے کہ گاہک اُسی کے پاس مرنے جاتے تھے۔''

''مجھے تو لگتا ہے کہ وہ کسی یار کے ساتھ بھاگ گئی۔ جب سے گئی ہے اُس کی نہ کوئی خیر نہ خبر۔ یہاں ہوتی تو ایک آدھ بار یہاں مرنے ضرور چلی آتی۔ لگتا ہے اب وہ کبھی نہیں آئے گی۔ اُس کا قصہ ختم ہی سمجھو۔''

اس طرح کی باتیں روز کا قصہ تھا۔ دراصل وہ اب بھی مریم سے اسقدر خائف تھیں کہ اُس کا نام لیتے ہی اُنکا دل کانپ ضرور اُٹھتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں یہی دعا کرتی رہتی تھیں کہ اب وہ کبھی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

لوٹ کر نہ آئے پر اُنکی یہ ساری دعائیں بے کار ثابت ہوئیں جب ایک دن مریم سویرے سویرے مچھلیاں لے کر فٹ پاتھ پر آ کے بیٹھ گئی۔ اُسے دیکھ کر اُن کے چہرے فق ہو گئے۔ وہ اُس کے پاس جا کر اتنا بھی نہ پوچھ سکیں کہ وہ آج تک کہاں تھی۔ اُسے دیکھ کر وہ اپنے سارے پنجے چھکے ہی بھول گئیں اور لگیں ایک دوسرے کا منہ تکنے۔ مریم نے کلسم کو دیکھ کر بڑی بے خوفی سے کہا۔

''کیوں! مجھے دیکھ کر تم سب کو سانپ کیوں سونگھ گیا۔ کہیں تم یہ سوچ کے نہیں بیٹھی تھیں کہ اب میں کبھی واپس نہیں آوں گی۔؟''

''تم آو نہ آو میری جوتی سے۔ تم کوئی رزاق ہو کیا جو تم نہیں رہو گی تو ہمیں رزق نہیں ملے گا۔ ارے وہ رحیم و کریم ہے۔ وہ سب کو روٹی دیتا ہے۔'' کلسم نے بڑی ہمت کر کے جواب دینے کی کوشش کی۔ اُس کی سکھیاں اس جواب سے بڑی خوش ہوئیں۔ مریم نے غصے سے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا۔ اتنے میں ایک گاہک اُسے دیکھ کر خوشی سے اُچھل پڑا اور وہ حیرت و مسرت کے ملے جلے لہجے میں اُس سے بولا۔

''اری تم کب آ گئی۔ تم تو ایسے غائب ہو گئی تھی جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ کہاں تھی تم اتنے دنوں؟''

''بڑی لمبی کہانی ہے۔ کبھی فرصت سے سناوں گی۔ اس وقت کہیے کتنے کلو مچھلی دے دوں۔''

''لینے کا پروگرام تو تھا نہیں پر تم کہہ رہی ہو اسلئے میں تم کو مایوس نہیں کروں گا۔ چلو دو کلو مچھلی دے دو۔''

ساتھ میں بیٹھی مچھی والیوں کے منہ اُتر گئے۔ وہ ایک دوسرے کی طرف ایسی بے بسی اور لاچارگی کے ساتھ دیکھنے لگیں جیسے کہہ رہی ہوں کہ اب پھر سے اُن کی قسمت میں سوکھا پڑ جائے گا۔ اب ساری ہریالی اسی کی طرف چلی جائے گی۔ وہ دل ہی دل میں اُسے کوسنے لگیں۔ جی میں آ رہا تھا کہ اسے بالوں سے پکڑ کر پورے بازار میں گھما کر لے آئیں۔ سات توں سے اسکا منہ کالا کر دیں۔ اُس کی واپسی اُنکے لئے نیک شگون نہ تھی۔ گاہک پھر سے اُس کے جال میں پھنستے چلے جا رہے تھے اور وہ بیٹھی بیٹھی مکھیاں اُڑا رہی تھیں۔

ایک دن صبح صبح کا وقت تھا۔ وہ تینوں جلدی سے آ کر بیٹھ گئی تھیں جب کہ مریم کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ تینوں دل ہی دل میں یہی دعا مانگ رہی تھیں کہ خدا کرے کہ مریم کہیں فنا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہو جائے۔ کوئی اُسے بھگا کر لے جائے یا وہ کسی کے ساتھ بھاگ جائے۔ وہ اسی سوچ میں غلطاں وپیچاں تھیں کہ کلسم نے سارہ سے کہا:

''وہ بدذات کہیں دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ خدا اُسے غارت کردے۔ ایک بار پھر ہمارا دھندہ چوپٹ کر دیا۔ ایک ایک کر کے ہمارے گاہک ہم سے ٹوٹتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر یہی حال رہا تو ہمیں یہ دھندہ چھوڑ کر کوئی اور دھندہ کرنا پڑے گا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو بہن'' حبلہ نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ ''اللہ کرے اسے لو کے لگ جائیں۔ میرے شوہر کو بے کار کر دیا۔ جب سے اُس کی نوکری چلی گئی تب سے وہ مردود گھر میں پڑا ہوا ہے اور بات بات پر مجھے طعنے دیتا رہتا ہے کہ میری وجہ سے اُس کی نوکری چلی گئی۔۔ کوئی کام کرنے کو بولو تو کام کا نام سنتے ہی اُس کی اماں مر جاتی ہے۔ اچھا خاصا گزارہ چل رہا تھا میرا۔ خدا اسکا ستیاناس کر دے میرے بچوں کا آزوقہ چھین لیا اُس کم ذات نے۔ اب میں اکیلی جان کس کس کو دیکھتی پھروں۔ بچوں کو دیکھوں یا اپنے نکھٹو مرد کو۔'' کہتے کہتے اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔

سارہ جو بہت دیر سے چپ تھی، حبلہ کو سہارا دیکر بولی۔

''حوصلہ رکھو بہن۔ اُس کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔ جس نے تیرے ہاتھ کا نوالہ چھین لیا اللہ اُس کی روٹی ہی چھین لے گا۔''

وہ سب باری باری مریم کو کوسنے دے رہی تھیں کہ اچانک ایک کار اُنکے سامنے آ کے رکی اور اُسمیں سے مریم اتراتے ہوئے اُتر گئی۔ وہ تینوں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس کی طرف یوں دیکھنے لگیں جیسے اُنہوں نے کوئی عجوبہ دیکھ لیا ہو۔ اُنکی حالت ایسی تھی کہ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم۔ گاڑی چلانے والا ایک خوش رو لونڈا تھا۔ اُسنے مریم کا مچھلیوں سے بھرا باسن گاڑی سے اُتارا اور پھر وہ مسکرا کر مریم کی طرف دیکھ کر گاڑی کی طرف بڑھا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے چلا گیا۔ وہ تینوں ابھی تک صم بکم بنی بیٹھی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی ڈراونا خواب دیکھ رہی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ اس خواب سے باہر آئیں تو وہ ایک دوسرے کی طرف ایسی نظروں سے دیکھنے لگیں جیسے وہ اشاروں کنایوں سے کچھ سمجھنے اور کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ تھوڑے توقف کے بعد جب مریم ایک گامک کی طرف متوجہ ہوگئی تو ان کے بیچ کچھ کھسر پھسر چلنے لگی۔ مریم ان سے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بے پرواہ ہو کے اپنے کام میں مشغول تھی۔ کلسم نے حبلہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

''یہ لونڈا کون تھا جو اس کی تابعداری میں ایسا کھڑا تھا جیسے اسکا خصم ہو۔''

''ہوسکتا ہے اس نے ایک اور خصم کرلیا ہو۔ ویسے یہ اپنے بارے میں کچھ بتاتی نہیں۔ کون جانے اب تک یہ کتنے خصم کر چکی ہے۔ اس کی ماں نے بھی تین تین خصم کر لئے تھے۔ لگتا ہے یہ بھی اپنی ماں کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔ یہ چاہے کتنا بھی چھپا کے رکھ دے جب پاپ کا گھڑا بھر جائے گا تو سارا کیا دھرا عام ہو جائے گا۔ ایک دن سب کو پتہ چلے گا کہ یہ کتنی بڑی حرافہ ہے۔ آدمی کتنا ہی شاطر اور کایاں کیوں نہ ہو عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔''

وہ روز اُسے کار میں چھوڑنے آتا تھا اور اُسے وہاں چھوڑ کر چپ چاپ چلا جاتا تھا۔ یہ تینوں اُس لونڈے کو ایسی نظروں سے گھورنے لگتی تھیں جیسے وہ یوسف ثانی ہو اور اُسے پھسلانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ جب وہ انکی طرف تضحیک بھری نظروں سے دیکھتا تھا تو یہ غصے سے اُبل پڑتی تھیں اور منہ ہی منہ میں اُسے صلواتیں سنانے لگتی تھیں۔ اُس سے بھی جی نہ بھرتا تھا تو وہ روز نئی نئی کہانیاں گڑھنے لگتی تھیں اور ان کہانیوں کو عام بھی کر رہی تھیں۔ حبلہ، کلسم اور سارہ نے مریم کو رسوا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ وہ چلا چلا کر سبھی گاہکوں کو بتا رہی تھیں کہ مریم بدچلن ہے۔ ایک غنڈے موالی سے اُس کا چکر چل رہا ہے۔ وہ روز اُس کے ساتھ جاتی ہے اور اپنا منہ کالا کر کے آتی ہے۔ بہت کم لوگ اُنکی باتوں پر یقین کرتے تھے۔ کوئی انکی باتوں کو جھٹلانے کی ہمت بھی نہیں کر پاتا تھا کیونکہ سبھی لوگ ان عورتوں کو جانتے تھے۔ ان سے حجت کرنا بھڑ کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے سے کم نہ تھا اسلئے وہ ایک کان سے سنتے اور دوسرے کان سے اُڑاتے تھے۔

ایک دن جب وہ لونڈا مریم کو چھوڑ کے چلا گیا، ٹھیک ایک گھنٹے بعد وہ پھر سے لوٹ کر آیا۔ وہ جب گاڑی کھڑی کر کے نیچے اُترا تو سب نے دیکھا اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اُس کے ساتھ ایک عمر رسیدہ آدمی بھی تھا جو اُس کے ساتھ ہی گاڑی سے نیچے اُتر گیا۔ مریم نے جب اُن کو اس حال میں دیکھا تو اُس کے ہوش وحواس باختہ ہو گئے اور وہ اُس لونڈے کی طرف دوڑی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتی وہ اُسے بانہہ سے پکڑ کر گاڑی میں بٹھا گیا۔ جاتے جاتے اُسنے اُس ادھیڑ عمر کے آدمی سے کہا۔ ''ہم جب تک واپس لوٹ کر نہیں آتے تم اس کی مچھلیوں کا خیال رکھنا کاکا۔'' یہ کہکر وہ گاڑی کو بھگانے لگا۔ انکی یہ ہڑبڑاہٹ اور بدحواسی دیکھ کر تینوں کی

CC-0. Kashmir Research Institute. Srinagar. Digitized by eGangotri

باچھیں کھل گئیں۔ اتنا تو اُنہیں یقین آ ہی گیا کہ مریم پر کوئی نہ کوئی آفت ضرور ٹوٹی ہے۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر بغلیں بجانے لگیں اور اُنکے اوجھل ہوتے ہی تینوں مچھی والیاں اُس ادھیڑ عمر کے گرد جمع ہو گئیں اور جھوٹ موٹ کی ہمدردی جتاتیہوئے، اُس سے بڑی حلیمی سے پوچھ اُٹھیں۔

''خدا خیر کرے۔ سب کچھ ٹھیک تو ہے نا۔ آخر ایسا کیا ہوا جو مریم ننگے پاوں یہاں سے بھاگی؟''

''کیا بتاوں میں۔'' وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ ''اللہ کے رنگ بھی بڑے نرالے ہیں۔ جو اُس کی جتنی زیادہ بندگی کرتا ہے وہ اُسی کو اتنی ہی تکلیف میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ایک سال پہلے اسکا شوہر چلا گیا۔ اپنے پیچھے دو معذور اور ناتوان بچے چھوڑ گیا۔ وہ ذہنی طور ہی نہیں جسمانی طور بھی معذور ہیں۔ یہ جیسے تیسے کر کے انکی کفالت کر رہی تھی کہ اس کا دیور اندر ہو گیا۔ ڈیڑھ سال یہ اندر رہا۔ ابھی ابھی جیل سے چھوٹ کر آیا ہے۔ وہ کتنا ہی بدکار سہی مگر اپنی بھابی کو ماں کی طرح مانتا ہے۔ اس کے ہر حکم پر اپنی جان تک نچھاور کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ ابھی یہ مریم کو چھوڑنے آیا تھا کہ پیچھے سے بڑا لڑکا رفیق سیڑھیوں سے گرا۔ حالت بہت نازک ہے۔ اللہ جانے بچ بھی جائے گا کہ نہیں اُسی کو لے کر اسپتال جا رہے ہیں۔ بیچاری مریم! ایک وہ مریم تھی جس کے لال کو صلیب پر چڑھایا گیا اور ایک یہ مریم جو دو جوان بچوں کو پل پل مرتے دیکھتی ہے۔ اسنے ایک پل بھی سکھ کا نہیں دیکھا پھر بھی دیکھو کیسے مسکراتی رہتی ہے۔ کوئی نہیں جانتا اس ایک مسکراہٹ کے پیچھے وہ کتنے غم واندوہ چھپا کے بیٹھی ہے۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی مصیبت اسے گھیر لیتی ہے پھر بھی وہ کس جی داری سے حالات کا مقابلہ کر رہی ہے۔ اس عورت کو دیکھ کر کسی کا بھی کلیجہ منھ کو آ سکتا ہے۔ مولا اس پر رحم کرے'' کہکر اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ تینوں دکھ اور حیرت سے ایک دوسرے کا منھ تکنے لگیں۔ اُنہیں ایسا لگا جیسے یکا یک انکی مچھلیاں سڑ گئی ہوں اور اُن سے اُٹھنے والی سڑاند اور عفونت سیدھے اُنکے اندر ابھر گئی اور اس سڑاند سے اُنکی روح چیخ اُٹھی ہو۔ اُن کے سر آپ ہی آپ نیچے جھکتے چلے گئے۔ ایسا لگا جیسے اُن پر چھاجوں پانی پڑا ہو۔ وہ اپنے آپ کو ابتدال کی انتہائی پستیوں میں گلے گلے تک ڈوبتی ہوئی محسوس کرنے لگیں۔ مریم ایک بار پھر اُن کو چت کر گئی تھی۔

■ ■ ■

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

آوارہ کُتّا

موتی ایک آوارہ کتا تھا جو میرے محلے میں شب و روز گھومتا رہتا تھا۔ اس محلے کے کچھ لوگ اُسے پسند کرتے تھے اور کچھ ناپسند۔ حالانکہ وہ بڑا بے ضرر اور خوش خصال کتا تھا جو صرف بھونکنا جانتا تھا کاٹنا نہیں، پھر بھی کچھ نفاست پسند لوگ اُسے دیکھ کر ہی چڑ جایا کرتے تھے۔ وہ رات بھر ہمارے محلے کی مفت میں چوکیداری کرتا تھا پھر بھی انعام میں اُسے ڈنڈے ہی ملتے تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ بیچارا بغیر کسی اُجرت کے ہماری چاکری کئے جا رہا ہے پھر بھی لوگ اُس کی وفاداری سے چشم پوشی کر لیتے تھے۔ وہ ذرا سا کیا بھونکنے لگتا کہ گھروں میں بیٹھے لوگ غصے سے لال پیلے ہو جاتے اور وہیں پر بیٹھے بیٹھے وہ اُسے صلواتیں سنانے لگتے تھے۔ وہ رات بھر اس لئے بھونکتا رہتا تھا کہ چور اور نقب زن اس محلے سے پرے رہیں۔ وہ اس کام کے عوض ہم سے کسی صلے کی اُمید نہیں رکھتا تھا۔ وہ تو بس اپنا فرض نبھائے جا رہا تھا جو اُسے فطرت نے سونپا تھا۔ چنانچہ اُس کی فرض کی ادائیگی سے محلے کا محلّہ بے فکری سے سویا رہتا تھا اور وہ ساری ساری رات ایک ٹانگ پر کھڑا رہ کر ادھر اُدھر کی ٹوہ لیتا رہتا تھا اُس پر ستم یہ کہ رات بھر کا تھکا ماندہ یہ کتا جب دن کو کسی دوکان کے تھڑے کے نیچے یا کسی مکان کے پھاٹک کے پاس دم ہلا کر بیٹھنے کی کوشش کرتا تو صاحب مکان اُسے ڈنڈے مار کر بھگا دیتے تھے۔ کتنی بڑی ستم ظریفی تھی یہ کہ رات بھر وہ جن دوکانوں اور مکانوں کی رکھوالی کرتا تھا وہی اُسے مار کر بھگاتے تھے۔ وہ گھر کے مکینوں سے پناہ مانگنے کی کوشش کرتا تو وہ پھٹ پھٹ دُر دُر کر کے اُسے پرے ہٹا دیتے تھے پر وہ بھی اتنا ڈھیٹ اور بے شرم تھا کہ گھوم پھر کے وہ پھر اُسی جگہہ ڈیرہ ڈالتا تھا جہاں سے اُسے بھگایا جاتا تھا۔ کھانا بھی اُسے کوئی پیار سے نہیں کھلاتا تھا بس جہاں کسی کا جھوٹن پڑا ملا کھا لیا یا کسی نے از راہ ترحم ایک روٹی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کا ٹکڑا ڈال دیا تو اُسی سے گزارہ کرلیا۔ یعنی ملا تو روزی نہیں تو روزہ۔

جانے کیوں مجھے یہ بھورے رنگ کا بازاری کُتا موتی پیارا لگتا تھا۔ میں جب صبح صبح گھر سے آفس کی طرف نکلتا تھا تو موتی دم اُٹھائے مجھے پھاٹک پر کھڑا ملتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری ٹانگوں سے لپٹ جاتا تھا اور پھر میرے پیر چاٹنے لگتا تھا۔ میں پیار سے اُس کے بدن پر ہاتھ پھیر کر آگے بڑھتا تھا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چلا آتا تھا اور جب تک میں اُسے علی نانبائی کی دوکان پر جا کر اُسے ایک روٹی نہیں کھلا دیتا تھا وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا۔ شام کو بھی مجھے وہ اسی طرح انتظار کرتا ہوا ملتا تھا۔ بس ایک پل کا یہ پیار اور دلار اُسے بہت سکون اور فرحت دے جاتا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ جانور بڑے حساس اور جذباتی ہوتے ہیں۔ موتی بھی بڑا احساس تھا۔ اگر کسی دن میں اُسے بوجہ عجلت نظر انداز کر کے نکل جاتا تھا تو وہ بڑا اُداس اور افسردہ ہو جایا کرتا تھا۔ اس کا احساس مجھے شام کو گھر لوٹتے وقت تب ہوتا تھا جب وہ مجھے دیکھکر مجھ سے دور دور بھاگنے لگتا تھا میں اُسے آواز دیتا تھا تو وہ میری طرف بڑھنے کی بجائے کسی اور سمت میں دوڑنے لگتا تھا۔ میں سمجھ جاتا تھا کہ وہ مجھ سے ناراض ہے سو میں کچھ دیر تک اُس کی اس آنکھ مچولی کا مزہ لیتا تھا۔ جب وہ کافی دیر تک ادھر اُدھر دوڑ دوڑ کے تھک جاتا تھا تو وہ آکر میرے قدموں میں لیٹ جاتا تھا اور اسطرح وہ اپنی ناراضگی کا اظہار کرتا تھا۔

ایک بار کسی نے میونسپلٹی والوں کے پاس جا کر یہ شکایت کی کہ موتی بچوں کا کاٹنے لگا ہے۔ شکایت ملتے ہی میونسپلٹی والے ترت پھرت محلے میں پہونچ گئے موتی کو اُٹھانے کے لئے۔ موتی بھی اتنی آسانی سے کسی کے قابو میں کہاں آنے والا تھا۔ اُسنے سرکاری اہلکاروں کو اپنے پیچھے خوب دوڑایا۔ جب اُسے لگا کہ اب اُس کا دوڑنا بے سود ہے تو وہ سیدھے میرے کمرے میں در آیا۔ وہ کافی ڈرا سہما ہوا تھا۔ وہ میری طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھنے لگا جیسے مجھ سے کہہ رہا ہو کہ مجھے ان جلادوں سے بچالو۔ میں نے اُسے پیار کیا اور اُس کے پیچھے پڑے میونسپلٹی اہلکاروں کو روکتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہے بھائی۔ آپ میرے کتے کے پیچھے کیوں پڑے ہیں؟''

''آپ کا کتا؟'' ایک اہلکار نے حیران ہو کے پوچھا:

''جی ہاں یہ میرا پالتو کتا ہے موتی جسے میں صبح صبح کھلا چھوڑ دیتا ہوں تا کہ یہ گھوم پھر کے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

آجائے۔'' میں نے موتی کی خاطر صریحاً جھوٹ بولا تھا۔

''صاحب ہمارے پاس تو یہ شکایت آگئی ہے کہ یہ بازاری کتا ہے اور بچوں کو کاٹتا ہے۔''

''آپ کو لگتا ہے یہ کسی کہ کاٹ سکتا ہے۔ ضرور کسی نے آپ لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے۔''

وہ میرے اس بیان کے بعد چپ چاپ چلے گئے۔ اُن کے چلے جانے کے بعد موتی میرے قدموں میں لوٹ کر میرے پاوں اسطرح چاٹنے لگا جیسے وہ میرا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہو۔ میں نیچے بیٹھ کر اُسے پچکارنے لگا۔

زندگی بڑے چین وسکون سے گزر رہی تھی کہ اچانک ایک ایسا طوفان اُٹھا جس نے آن کی آن میں سب کچھ تلپٹ کر کے رکھ دیا۔ یہ سن نوے کی بات ہے جب کشمیر میں شورش نے سر اُٹھا لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ اُلٹ پلٹ ہو گیا۔ رواں دواں زندگی کو جیسے اچانک بریک لگ گئی۔ بارود کے دھوئیں سے فضا مسموم ہو کر رہ گئی۔ حالات نے ایسی کروٹ لی کہ اپنے بیگانے ہو کر رہ گئے۔ آئے دن نہتے اور بے قصور شہری گولیوں کا نشانہ بننے لگے۔ ہر طرف موت کا تانڈو جاری تھی۔ جو قصوروار تھے وہ تو بچ کر نکل جاتے تھے اور جن کا کوئی قصور نہیں ہوتا تھا وہ فائرنگ کی زد میں آجاتے تھے۔ بھرا پرا شہر شہر خموشان کی طرح لگنے لگا۔ دن میں تو زندگی ادھر اُدھر رینگتی ہوئی دکھائی دیتی تھی مگر شام ہوتے ہی شہر ایک دم سنسان اور ویران ہو جاتا تھا۔ لوگ چراغ میں بتی پڑنے سے پہلے ہی گھر کا رخ کرتے تھے اور جو خیریت سے گھر پہونچ جایا کرتے تھے وہ سجدہ شکر بجالاتے تھے کہ آج کا دن خیر و عافیت سے گزر گیا۔ شام کے بعد گھر کے افراد اپنے ہی گھر میں اسیر بن کر رہتے تھے۔ کھڑکیاں اور دروازے اندر سے بند کئے جاتے تھے تاکہ باہر کا کوئی آدمی گھر میں نہ گھس سکے۔ خوف و دہشت کا عالم یہ تھا کہ گھر کی کوئی درز کھلی نہ چھوڑی جاتی تھی کہ کہیں موت وہیں سے نہ در آئے۔ ایسی لاچار اور بے بس ہو کے رہ گئی تھی زندگی۔

جب کھلانے والوں کے ہی جان کے لالے پڑے ہوں تو ایسے میں موتی کی سدھ لینے والا کون تھا۔ کون اُس کے لئے روٹی لے کر آتا۔ بسا اوقات وہ بھوکوں پیٹ ہی محلے کی نگہبانی کرتا رہتا تھا۔ لوگ بھلے ہی اُس سے لاتعلق ہو چکے تھے مگر وہ اپنے فرض سے منہ موڑنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اب تو اُس کا کام پہلے کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی بڑھ چکا تھا۔ رات کو موت کے سوداگر اپنے اپنے بلوں سے نکل آتے تھے اور مخبری کے نام پر لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتے تھے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

موتی شاید اس بدلاو کو سمجھ گیا تھا اسلئے وہ رات بھر بھونک بھونک کر محلے والوں کو باہر کی ہر ہلچل سے آگاہ رکھتا تھا۔

اسی بیچ شہر کے کئی ہندوں کی ہلاکت کی خبر نے اقلیتی فرقے میں کھلبلی مچادی۔ ایس افراتفری مچ گئی کہ جس کے جہاں سینگ سمائے وہ وہاں بھاگا۔ ایک بار کسی قوم یا فرقے میں بکھراو شروع ہو جائے تو وہ تھمنے کا نام نہیں لیتا۔ چل چلاو کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کشمیری ہندو جو قرن ہا قرن سے بھاگتے کے آگے اور مارتے کے پیچھے رہے ہیں، ایسے حالات میں بھاگنے کے سوا اور کیا کر سکتے تھے سو جو بچے تھے اُنہوں نے بھی اُداسا کسنا شروع کیا۔ ایک رات میرے محلے کے آدھے سے زیادہ ہندو چوروں کی طرح گھر سے ایسے بھاگے کہ بغل میں رہنے والے پڑوسی کو بھی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اپنی برادری کے لوگوں کو اسطرح نقل مکانی کرتے دیکھ کر میری ہمت جواب دینے لگی۔ اب اس محلے میں صرف میرا ہی پریوار ایسا تھا جو اب تک ٹکا ہوا تھا۔ میں شاید اور کچھ دن رکنے کا حوصلہ دکھا پاتا مگر میرے گھر والے کافی ڈرے ہوئے تھے۔ وہ جلد سے جلد اس قتل گاہ سے نکل جانا چاہتے تھے۔ چنانچہ گھر والوں کی ضد کے آگے میری ایک نہ چلی اور میں بھی ایک رات چوروں کی طرح ٹرک میں تھوڑا بہت سامان لاد کر اپنے گلستان کو خیر باد کہہ کے نکل گیا۔ جب ہم ٹرک میں سوار ہوئے تو موتی بہت دور تک ہمارا پیچھا کرتا رہا۔ میرے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ میں رک کر اُسے پیار کرتا اُسے پچکارتا۔ وہ بہت دور تک ہمارے ٹرک کا پیچھا کرتا رہا۔

میں نے جموں پہونچ کر ایک کمرہ کرایہ پر لے لیا اور از سر نو اپنی زندگی کے تانے بانے بننے لگا۔ ایک تو جموں کی قیامت خیز گرمی اوپر سے تنگ دستی۔ جو کچھ میں گھر سے اُٹھا کر لایا تھا وہ اونٹ کے منہ میں زیرہ کے برابر تھا۔ میری پونجی ایک آدھ مہینے میں ختم ہو گئی اور مجھے آٹے دال کا بھاو معلوم پڑنے لگا۔ بد بختیوں اور کٹھنائیوں نے سر اُٹھانا شروع کیا۔ میں نے ادھر اُدھر خوب ہاتھ پاوں مارے پر اُمید کی کرن کہیں نظر نہیں آئی۔ میں اپنے بچوں کو بھوکوں مرتے نہیں دیکھ سکتا تھا اسلئے میں ہر روز جموں کے بس اڈے پر اس اُمید کے ساتھ بیٹھ جایا کرتا تھا کہ کہیں سے کوئی فرشتہ رحمت نکل آئے جو مجھے اس مصیبت سے باہر نکال سکے۔ اُن دنوں کشمیر سے بہت سارے دلال جموں آکر کشمیری ہندوں کی جائیداد بکوانے کا کام کرتے تھے۔ میری حالت اسقدر خستہ تھی کہ میں اپنا آبائی مکان بیچنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ جب جان ہے تو جہان ہے۔ مکان کا کیا ہے زندہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

رہے تو آج نہیں تو کل نیا مکان بنوالیں گے۔

میرے محلے کے آدھے سے زیادہ مکان بک چکے تھے۔ میرا مکان تین منزلہ تھا۔ بڑے چھوٹے ملا کر اُس میں چودہ کمرے تھے۔ ستھو بر برشاہ کا یہ مکان کئی دلالوں کی نظر پر چڑھ چکا تھا۔ وہ اسے خریدنے کے لئے بے تاب تھے کیونکہ مستقبل میں اسے ہوٹل میں تبدیل کیا جاسکتا تھا سو جب رجب دلال نے میرے سامنے دس لاکھ کی آفر رکھی تو مجھے لگا جیسے میری منہ مانگی مراد پوری ہوئی۔ میں نے ترت پھرت رجب چاچا سے پچاس ہزار روپے پیشگی کے طور پر لئے اور اسطرح میں نے اپنے اُس آشیانے کا سودا کرلیا جو میرے باپ نے بڑے چاو سے بنوایا تھا۔

میں نے جب گھر پہونچ کر بیوی کے سامنے پچاس ہزار کے نوٹ رکھ دئے تو میری بیوی بملا کی آنکھیں پچاس ہزار دیکھ کر پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ حیرت زدہ ہو کے مجھ سے استفسار کرنے لگی۔ ''یہ اتنے سارے پیسے کہاں سے آگئے۔؟''

''میں نے گھر بیچ دیا'' میں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

''آپ نے گھر بیچ ڈالا'' وہ تیورا کے بولی۔ اچانک اُس کی آواز بھاری ہوگئی۔ وہ گلوگیر ہو کے بولی۔ ''جب ہم واپس لوٹیں گے تو پھر ہم کہاں رہیں گے؟''

''تمہیں کیا لگتا ہے ہم کبھی لوٹ پائیں گے؟''

''کیوں نہیں لوٹ پائیں گے۔ وہ ہماری جنم بھومی ہے۔ اپنی جنم بھومی سے کوئی بھلا دور رہ سکتا ہے کیا؟''

''اُس جنم بھومی کو اب بھلانے کی عادت ڈالو۔ اب ہم کو ان ہی تپتے میدانوں میں اپنی بچی کھچی زندگی گزارنی ہوگی۔ ہمیں اسی تڑاقے کی گرمی میں اپنا مقدر سنوارنا ہوگا شاید ہماری تقدیر میں یہی لکھا تھا۔ کاغذ پر لکھی تحریر تو بدل سکتی ہے البتہ قسمت کے لکھے کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔''

میری باتوں نے سنتوش کو کافی دل آزردہ اور افسردہ کردیا۔ وہ ایک کونے میں بیٹھ کر بہت دیر تک چپکے سے آنسو بہاتی رہی۔ روتی بھی کیوں نا۔ اُس کا تو گھر چھن گیا تھا۔ گھر کیسا بھی ہو ،سیمنٹ گارے سے بنا ہو یا کچی مٹی سے، عورت کی پہچان تو گھر سے ہی ہوتی ہے۔ وہ اس گھر کے ساتھ جذباتی طور پر جڑی ہوتی ہے۔ وہ اس سچ کو کس دل سے سہن کر پاتی کہ اُس کا گھر ہمیشہ کے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

لئے اُس سے چھن گیا ہے۔ وہ کئی روز تک مجھ سے کچھی کچھی سی رہی۔ سیدھے منہ مجھ سے بات بھی نہیں کرتی تھی۔ میں کچھ پوچھتا تو کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔ گھر بک جانے کا دکھ مجھے بھی تو تھا پر جینے کے لئے اس کے سوا اور چارہ بھی کیا تھا۔ کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ جب پرانا گھر بکے گا تو اُس کی جگہہ ایک نیا گھر بنے گا۔ ویسے بھی صدا کسی کی رہی نہیں۔ جسطرح رت بدلتے ہیں اسی طرح زندگی کے رنگ بھی بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی سکھ تو کبھی دکھ۔ کوئی بھی چیز پائدار نہیں ہے۔ دکھ سکھ تو دھوپ چھاوں کی طرح ہیں۔ کل جو تھا وہ آج نہیں ہے اور کل جو ہوگا وہ پرسوں نہیں ہوگا یہی تو قدرت کا دستور ہے۔

ایک ہفتے کے بعد رجب دلال اچانک میرے گھر پر نازل ہوا۔ وہ بڑا دکھی اور پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ اُسنے جو خبر سنائی وہ خوش کن نہیں تھی۔ جس شخص کو رجب دلال میرا مکان بیچنے والا تھا، وہ جب اُسے مکان دکھانے لے گیا تو نہ جانے موتی کہاں سے نکل آیا اور اُس نے اُس شخص پر حملہ کر دیا نہ صرف اُس کے کپڑے پھاڑ ڈالے بلکہ سارے کے سارے دانت اُس کے بدن میں پیوست کر دئے۔ وہ خون اُگلتا ہو وہاں سے بھاگا۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ اسپتال میں بھرتی ہے۔ میں اس خبر سے حیران و ششدر ہو کے رہ گیا۔ موتی نے آج تک کسی کو کاٹنا تو دور ایک کھرونچ تک نہ ماری تھی۔ آخر ایسا کیا ہوا جو وہ اتنا خونخوار ہو گیا۔ میں نے رجب علی کی طرف دیکھا۔ اُس کا خون اُبل رہا تھا۔ وہ غصے سے اپنی مٹھیاں بھینچ کر دانت پیستے ہوئے بولا۔

''میرا بس چلتا تو میں اُس بازاری کتے کو گولی سے اُڑا دیتا۔ یہ تو ستیاناس ہو آپ کے محلے والوں کا جو اُس کی حمایت میں کھڑے ہو گئے اور کتے کو کچھ کہنے کی بجائے اُلٹے مجھ سے ہی سوال کرنے لگے کہ آخر میں نے کس کی اجازت سے اس مکان کا پھاٹک کھولا۔ میں نے کہا کہ اس مکان کا روپ کشن سے میرا سودا ہوا ہے۔ وہ تو یہ بات سن کر ہتھے سے اُکھڑ گئے اور مجھ سے کہنے لگے کہ اُسکو کس نے یہ اختیار دیا ہے کہ وہ اپنی موروثی جائیداد کسی اور کو سونپ دے۔ اُسے ہر حال میں یہاں آنا ہی ہوگا۔ جب یہ کتا اُس کے بنا نہیں رہ سکتا تو ہم انسان اُس کے بنا کیسے رہ پائیں گے اسلئے کان کھول کر سن لو یہ مکان کسی بھی قیمت پر نہیں بکے گا۔ ہم اگر اسے بیچنے کی اجازت دے بھی دیں لیکن موتی کو کون سمجھائے گا۔ جب سے وہ لوگ یہاں سے چلے گئے ہیں تب سے اس نے اس گھر کا دوار نہیں چھوڑا ہے۔ رات دن اس گھر کی رکھوالی کرتا رہتا ہے۔ اس کے رہتے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اس گھر میں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ اسے کھانے پینے کی پرواہ ہی نہیں رہتی۔ کبھی کوئی کچھ کھلا دیتا ہے تو کھا لیتا ہے نہیں تو بھوکا پیاسا یہیں بیٹھا رہتا ہے ایک چوکیدار کی طرح۔"

یہ کہانی سن کر میں رو پڑا۔ وہ بازاری کتا جس کے ساتھ میں نے پیار کے کچھ پل بانٹے تھے آج وہ اُس پیار کی قیمت اپنی جان سے چکا رہا تھا۔ سنتوش بھی یہ بات سن کر اپنے آپ کو روک نہ سکی۔ وہ تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھال کر رجب علی سے کہا۔

"رجب کاکا جب موتی نہیں چاہتا کہ وہ مکان بکے تو وہ بکے گا نہیں۔ آپ ابھی اپنے پیسے واپس لے کر جایئے۔ اب وہ مکان نہیں بکے گا۔"

میں نے سنتوش سے وہ پیسے منگا کر رجب علی کو واپس کئے تو اُس کا چہرہ اُتر گیا اور وہ مجھے ڈراتے ہوئے بولا۔

"روپ کشن! جذبات میں بہنے کی کوشش نہ کرو۔ تمہارے لئے کشمیر کے حالات ابھی موافق نہیں ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ گھر کے چکر میں جان سے ہی ہاتھ دھونے پڑیں"

میں نے خشم سے رجب علی کی طرف دیکھا اور پھر بڑی بیزاری سے اُس کی بات کاٹ کر بولا۔ "جینا مرنا ایشور کے ہاتھ میں ہے۔ اگر میری موت وہیں پر لکھی ہے تو اُسے نہ تم ٹال سکتے ہو اور نہ میں۔ جس محلے کا ایک آوارہ کتا میرے لئے اتنا تڑپ رہا ہے اُس محلے کے لوگ میرے لئے کتنے تڑپ رہے ہونگے اسکا اندازہ تو مجھے اب ہو رہا ہے اسلئے نہ میں تمہارے ڈرانے سے اپنا فیصلہ بدل دوں گا نہ تمہارے بہکانے سے۔"

رجب علی پہلے تو آڑھا ترچھا ہونے لگا پھر بدر بدر کرتا ہوا نکل گیا۔ اُس کا یوں بیزار ہونا فطری تھا کیونکہ یہ سودا نہ ہونے کے باعث اُس کا بہت بڑا مالی نقصان ہوا تھا۔ دس لاکھ کے سودے میں اُس نے اپنے لئے کتنا کمیشن مقرر کیا تھا یہ تو وہی جانے پر یہ تو طے تھا کہ یہ سودا ٹوٹنے سے اُس کے ہاتھ سے ایک موٹی رقم چھن گئی تھی۔ اُس کے جانے کے بعد میں نے سنتوش کے چہرے پر شادابی دیکھی۔ وہ اس سودے کے ٹوٹنے سے نہال ہو گئی تھی۔ میں نے اُسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"تم عورتوں کی زبان کالی ہوتی ہے۔ ایک بار جس چیز کیلئے نا کہہ دی وہ نا ہو کر ہی رہ جاتی ہے۔ اب پڑ گئی نا تمہارے دل میں ٹھنڈک۔ ہو گیا نہ سودا کینسل۔"

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

''آپ کو مجھ سے کہیں زیادہ موتی کا احسان ماننا چاہیے جس نے ہمارے گھر کو بکنے نہ دیا۔ میرا دل کرتا ہے کہ میں اُڑ کے اپنے گھر جاوں اور موتی کو گلے لگا کر جی بھر کے پیار کروں۔ کتنا وفا دار کتا نکلا وہ۔''

''کتے تو سارے کے سارے ہی وفادار ہوتے ہیں۔ بس اُنکی وفاداری کو پرکھنے کا ہنر آپ کو آنا چاہیے۔''

ایک ہفتے کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ پہلے میں سری نگر جاوں گا۔ اگر مجھے حالات موافق لگے تو اگلے ہفتے میں بیوی بچوں کو وہاں بلا لوں گا۔ میرے اس فیصلے سے سبھی نے اتفاق کیا۔ سچ کہوں تو میں سری نگر پہونچنے کے لئے بے چین ہوا جا رہا تھا۔ میں اُڑ کر وہاں پہونچ جانا چاہتا تھا۔ اپنے یار دوستوں، اپنے پڑوسیوں اور خاص کر اپنے موتی سے ملنے کے لئے میں مرا جا رہا تھا۔

آخر دو دن کے جان لیوا انتظار کے بعد میں سری نگر پہونچ گیا۔ جب میں نے اپنے محلے میں پاوں رکھا تو پتہ نہیں میری آمد کی خبر کیسے پھیل گئی۔ لوگ گھروں سے دوڑتے ہوئے نکل آئے اور مجھ سے لپٹ لپٹ کر رونے لگے۔ میں بھی اپنے آنسو روک نہیں پایا۔ ایسا لگا جیسے ایک بھٹکی ہوئی روح اپنے خول میں واپس آ گئی ہو۔

گھر کے بنا ایک انسان شریر کے بنا ایک بھٹکتی ہوئی روح کی کی طرح ہوتا ہے۔ انسان اپنی جنم بھومی کو چھوڑ کر محلوں میں رہے، اُسے وہ سکھ اور وہ خوشی کہیں نصیب نہیں ہوتی جو اُسے اپنے گھونسلے میں میسر ہوتی ہے جس میں اُس نے جنم لیا ہوتا ہے۔ میں لوگوں سے ملتے ملاتے جب اپنے گھر کے پھاٹک کے پاس رک گیا تو میں نے دیکھا کہ میری بو سونگھتے ہی موتی تیزی سے ایک اندھیرے کونے سے نکل آیا اور پھر مجھ سے روٹھ کر ادھر اُدھر بھاگنے لگا۔ ایسا کر کے وہ اپنی ناراضگی جتا رہا تھا۔ حالانکہ وہ بہت مریل ہو چکا تھا پھر بھی نہ جانے اُسمیں اتنی توانائی کہاں سے آ گئی کہ بہت دیر تک وہ مجھ سے آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔ جب وہ تھک کر چور ہو گیا تو میں نے آگے بڑھ کر اُسے اپنی بانہوں میں بھر لیا اور پھر اُسے یوں پیار کرنے لگا جیسے وہ میرا بچہ ہو۔ وہ بھی فرط جذبات سے کبھی میرا منہ چومتا، کبھی میرے نھوں کو چاٹنے لگتا تھا۔ میری آنکھیں اشک بار تھیں۔ میرے پیچھے جو محلے کے لوگ کھڑے تھے، اُنکی آنکھیں بھی یہ منظر دیکھ کر آبدیدہ ہو گئیں۔ جذبات جب اُمڈ پڑتے ہیں تو اپنے ساتھ آنسوں کی طغیانی لے کر آتے ہیں۔ جذبات کا ریلا جس دل سے بھی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اُٹھے اظہار کی ادا اور انداز ایک جیسا ہوتا ہے۔

میرا لوٹ کے آجانا کسی نوید سے کم نہ تھا۔ گویا کہ حالات ابھی سدھرے نہیں تھے تاہم دلوں کی بستیوں میں پیار و محبت کی دنیا ویسی ہی آباد تھی۔ ہر کوئی بیتے دنوں کو یاد کر کے رو رہا تھا۔ وہ دن جب ہر طرف چین و امن تھا۔ خوشحالی اور آسودگی تھی۔ جب ان مرغزاروں میں قہقہے گونجا کرتے تھے۔ انسان دل سے برا نہیں ہوتا۔ اُسے حالات برا بنا دیتے ہیں۔ میرے محلے کے لوگ آج بھی ویسے ہی سیدھے سادھے اور مہربان تھے جیسے کہ وہ اس شورش سے پہلے تھے۔ گو کہ اُن کی زبان پر تالے پڑے تھے البتہ اُنکے دل کے پیمانے آج بھی پیار و محبت سے لبریز تھے۔

رات کو مجھے لے کر کافی کھینچا تانی ہوئی۔ کوئی کھانا کھانے کے لئے مجھے ایک طرف کھینچ رہا تھا تو کوئی دوسری طرف۔ آخر یہ طے پایا گیا کہ میں اپنے گھر میں تب تک کچھ نہیں پکاؤں گا جب تک سنتوش جموں سے آئے گی نہیں۔ خیر رات کا کھانا میں نے اپنے ایک مسلم پڑوسی کے یہاں کھالیا۔ کھانا کھا کے جب وہ میرے اصرار پر مجھے گھر چھوڑنے آیا تو یہ دیکھ کر میں دھک سے رہ گیا کہ موتی بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں اور وہ پھاٹک کے پاس بیٹھا نہ جانے کب سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں ایک انجانی سی چمک آ گئی اور پھر یہ چمک دفعتاً بجھ گئی۔ میں جب اُس کے قریب چلا گیا تو یہ دیکھ کر میں چکرا گیا کہ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں پریشان ہو اُٹھا۔ اس سے پہلے میں کچھ کر پاتا اُسنے میری بانہوں میں دم توڑ دیا۔ مجھے لگا جیسے میرا کوئی عزیز مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے روٹھ کر چلا گیا ہو۔ میں بے ساختہ اُس سے لپٹ کر بچے کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

■ ■ ■

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

سنتا کی گوری

سنتا کا پورا نام سنتو کھ سنگھ تھا پر پاس پڑوسی اور ناطے رشتے دار اُسے سنتا کے نام سے ہی جانتے تھے۔ سنتا جموں کے چاند پورہ گاوں میں اپنے چھوٹے سے پریوار کے ساتھ رہتا تھا۔ اُس کا خاندان بہت ہی چھوٹا تھا۔ ایک تو بیٹا بنتا سنگھ تھا جو بالی عمر سے گزر رہا تھا۔ ایک سات سال کی بیٹی رانو تھی جو سنتا کی آنکھ کا تارا تھی۔ ان کے علاوہ چاچی پریتم کور تھی جو بیوہ تھی اور لاولد تھی۔ وہ سنتا کو ہی اپنا بیٹا مانتی تھی۔ پریتم کور کافی ضعیف ہو چکی تھی۔ اب تو چلنے پھرنے کے لئے لاٹھی کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ اُس کے شوہر پریم سنگھ کی دس سال پہلے گولی لگنے سے موت ہوئی تھی، جب سے سنتا ہی اپنی چاچی کی تن من سے سیوا کئے جا رہا تھا۔

دراصل سنتا سنگھ کا گھر لائن آف کنٹرول سے بالکل سٹا ہوا تھا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ یہ گاوں سرحد سے چار ہاتھ کے فاصلے پر تھا۔ سرحد پر رہنا کتنا خطرناک ہوتا ہے اس کا ثبوت وہ گولیوں کے نشان تھے جو اس چھوٹے سے گاؤں کے ہر مکان کے سینے پر چیچک کے بدنما داغوں کی طرح نمایاں تھے۔ آئے دن کی گولہ باری نے اب تک کئی قیمتی جانیں لی تھیں۔ پریم سنگھ بھی اس گولہ باری کا اُسوقت شکار ہوا تھا جب وہ اپنے کھیتوں پر کام کر رہا تھا۔ اُس کی لاش آٹھ گھنٹے تک کھیتوں میں پڑی رہی کیونکہ دونوں طرف سے جم کے گولہ باری ہو رہی تھی۔ ایسے حالات میں گاؤں والے گھروں میں بنائے گئے خندقوں میں جائے پناہ لینے پر مجبور ہوتے تھے۔ کبھی کبھی تو گاوں والوں کو کئی کئی راتیں بھوکے پیاسے انہی خندقوں میں اوندھے پڑے پڑے گزارنی پڑتی تھیں۔

ان لوگوں کا آبائی پیشہ کھیتی باڑی تھا۔ کھیتی باڑی کے علاوہ یہ لوگ ڈھور ڈنگر بھی پال لیا کرتے تھے۔ فوج نے کئی بار اُنہیں یہ صلاح دی کہ وہ یہ علاقہ چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں کیونکہ یہاں رہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کر اُنکے جان و مال کو ہمیشہ خطرہ بنا رہے گا۔ فوج کے اس صلاح و مشورے کو اُنہوں نے سرے سے ہی خارج کر دیا۔ کسان کی پہچان تو اُسکے کھیت سے ہوتی ہے۔ جب اُنکے پاس کھیت ہی نہیں رہیں گے تو وہ کریں گے کیا؟ جئیں گے کیسے اور رہیں گے کہاں؟ چنانچہ کافی سوچ و بچار کے بعد یہی فیصلہ لیا گیا کہ چاہے اُن کی جان رہے یا چلی جائے وہ ان کھیتوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔ وہ جب تک زندہ ہیں وہ موت کے سایے میں جینا پسند کریں گے مگر اپنی زمین جائیداد سے کسی بھی قیمت پر الگ نہیں ہوں گے کیونکہ کسان اور کھیت کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ ان کی اس ہٹ کے آگے فوج بھی کمزور پڑ گئی۔

سنتا سنگھ کے پاس کافی زمین و جائیداد تھی۔ زمین جائیداد کے علاوہ اُس کے پاس چار بھینسیں، دو بیل اور ایک گائے تھی۔ سنتا کو ان سارے ڈنگروں میں سے سب سے زیادہ اپنی گائے پیاری تھی جس کا نام اُسنے گوری رکھا تھا۔ گوری کو تو اُسنے حرز جان بنا کے رکھا تھا۔ گوری بڑی سندر اور اصیل تھی۔ وہ گھر کے ہر فرد سے بہت پیار کرتی تھی۔ خاص طور پر وہ رانو کو بہت ہی زیادہ چاہتی تھی۔ جب بھی رانو اُسکے قریب جاتی تھی تو وہ اُسے اسطرح سے چاٹنے لگتی تھی جیسے رانو کو اُسی نے جنم دیا ہو۔ گوری کا چتلا رنگ و روپ، اُس کی کجراری آنکھیں اور اُس کا شان بے نیازی سے چلنا اُسے سب سے منفرد اور ممتاز بنا دیتا تھا۔ سنتا صبح جب نیند سے اُٹھتا تھا تو وہ سب سے پہلے گوری کا منہ دیکھ لیا کرتا تھا۔ اس کے دل میں یہ یقین پیوست ہو کر رہ گیا تھا کہ گوری کا منہ دیکھ کے آج تک اُسے کبھی کھونچ کھرونچ تک نہیں لگی تھی اسلئے وہ گوری کو پیار ہی نہیں بلکہ ایک طرح سے اُس کی پوجا کرتا تھا۔ گوری بھی اپنے مالک کے اشاروں کو بخوبی سمجھتی تھی۔ اُسنے گوری کو اسطرح ٹٹکاری پر لگا لیا تھا کہ وہ چاہے کتنی بھی دور نکل جائے اُس کی ایک سیٹی سن کر دوڑتی ہوئی چلی آتی تھی جب کہ باقی کے ڈنگر صدا ڈنگر ہی رہے۔

سنتا اکثر و بیشتر اپنے ڈنگروں کو خود ہی چرانے لے جاتا تھا مگر مارچ کے مہینے میں جب کھیتی باڑی شروع ہو جاتی تھی تو یہ کام بنتا کے ذمہ تھا۔ سنتا سنگھ کے لئے بسنت کے دو مہینے بڑے کٹھن اور دھوڑ دھوپ بھرے ہوتے تھے۔ کھیتوں کی جتائی، پھر نلائی۔ نلائی کے بعد سہاگہ پھیرنا پھر بوائی۔ یہ دو مہینے اس قدر تگ و دو سے بھرے ہوتے تھے کہ بسا اوقات سنتا کو روٹی کھانے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ بس بوائی ہو گئی تو سمجھو محنت ٹھکانے لگ گئی۔ اس کے بعد ہر طرف ہریالی ہی

CC-0. Krishna Research Institute Jammu. Digitized by eGangotri

ہریالی چھا جاتی تھی۔ مکئی کی فصل ہو یا گیہوں کی، یہاں کا ہوا پانی اتنا موافق تھا کہ کسانوں کے گھر لہر بہر ہو جایا کرتے تھے۔

اپریل کے مہینے کی بات ہے، سنتا سنگھ کھیتوں پر کام کر رہا تھا اور بنتا ڈنگروں کو چرنے کے لئے سرحد کے بالکل قریب لے گیا۔ سنتا نے بنتا کو ڈھور ڈنگر سرحد کے قریب لے جانے سے ممانعت کر کے رکھی تھی کیونکہ ڈھور ڈنگر ذرا سا بھی ادھر اُدھر بھٹک جاتے تھے تو اُس طرف کے کسان ان جانوروں کو اُٹھا کر لے جاتے تھے۔ یہاں کے کسان بھی دودھ کے دھلے ہوئے نہیں تھے۔ اُنکے جانوروں کے ساتھ وہ بھی یہی سلوک روا رکھتے تھے۔ اُن کا ڈنگر ذرا سا اُدھر ادھر کیا ہو لیا کہ یہاں کے کسان اُنہیں پکڑ کر سیدھے گھر میں باندھ کے آجایا کرتے تھے۔ مویشی چوری کا یہ سلسلہ بہت پرانا تھا۔ اب حالات ایسے دوستانہ نہ تھے کہ ایک دوسرے کے علاقے میں در آنے والے جانوروں کو واپس کر کے دوستی کی مثال قائم کر پاتے۔ جب دلوں میں رنجشیں، عداوتیں اور نفرتیں بھری پڑی ہوں تو ایسے میں اخلاق اور شرافت کے سارے فلسفے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ بس یاد رہ جاتی ہیں گزرے زمانے کی کڑواہٹیں اور تلخیاں۔

اُس دن بنتا باپ کے منع کرنے کے باوجود اپنے ڈنگر سرحد کے بالکل قریب لے کے گیا۔ ڈنگر بڑے اطمینان سے گھاس چرتے رہے اور بنتا ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر ستانے لگا۔ کب اُسے جھپکی لگی۔ کب اُس کا سر اُس کے گھٹنوں میں لٹک گیا اُسے پتہ ہی نہیں چلا۔ جب آنکھ کھلی تو اُسنے کیا دیکھا کہ گوری کہیں دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ ایک خوف کی لہر بجلی کی سرعت سے اُس کے اندر دوڑ گئی۔ اُسنے گوری کا نام لے کر زور زور سے آواز لگائی پر اُسے گوری کہیں نظر نہ آئی۔ بنتا نے اُسے ادھر اُدھر ڈھونڈا پر وہ کہیں نہ ملی۔ اب کے بنتا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور وہ ہڑ بڑا ہٹ میں باقی کے مویشی ہانکتا ہوا اپنے باپ کے پاس چلا گیا اور روتے روتے اُس سے بولا

''پاپا جی، گوری کتھوں نس گئی۔''

سنتا سنگھ یہ خبر سن کر پہلے تو دھک سے رہ گیا پھر وہ بے تحاشہ کھیتوں کی طرف دوڑا اور بدحواسی کے عالم میں زور زور سے گوری کو پکارنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ گوری جہاں بھی ہوگی اُس کی آواز سن کر دوڑتی ہوئی چلی آئے گی۔ وہ چلاتا رہا۔ کھیت کھلیانوں میں، ہرے بھرے اور چٹیل میدانوں، وہ کہیں نہیں ملی۔ وہ دروں اور کھائیوں میں ٹٹکاریاں لگاتا رہا مگر وہ کہیں دکھائی نہ دی۔ وہ سمجھ ہی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

نہیں پا رہا تھا کہ آخر وہ گئی کہاں۔ اُسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ جب شام کے سیاہ دھند لکے چار سو پھیل گئے تو وہ بھرے من اور بھیگی آنکھوں کے ساتھ گھر لوٹا۔ گھر پہونچ کر جب بیوی نے گوری کے بارے میں پوچھا تو جواب میں وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ اُسے روتے دیکھ کر رانو بھی رو پڑی۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھر میں کہرام مچ گیا۔ رونے کی آواز سن کر پاس پڑوسی دوڑے دوڑے چلے آئے۔ لگا کہ سنتا کے گھر کوئی آفت اُفتاد پڑی ہے۔ جب ماجرا واضع ہوا تو وہ بھی دکھ اور افسوس کا اظہار کر کے چلے گئے۔ سنتا اپنی گوری کی یاد میں اسطرح سیاپا کرتا رہا جیسے کوئی عزیز بچھڑ گیا ہو۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد جب بنتا بے خیالی میں باپ کے کمرے میں چلا گیا تو اُسے دیکھ کر سنتا کے سر پر جیسے شیطان سوار ہو گیا۔ اُسنے آو دیکھ نہ تاو۔ وہ بھوکے بھیڑیے کی طرح بنتا پر پل پڑا اور اُسے بے بھاو کی دینے لگا۔ پہلے ہاتھوں اور لاتوں سے اُس کی پٹائی کی پھر اُسکے جھونٹے کھسوٹتے ہوئے وہ اُسے زمین پر پٹخنے لگا۔ چاچی پریتم کور، پرمیت اور رانو دوسرے کمرے میں بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے۔ انہوں نے جب بنتا کی چیخ و پکار سنی تو پرمیت اور رانو کھانا چھوڑ کر اُس کی مدد کے لئے دوڑ پڑے۔ چاچی پریتم کور جو آٹھوں پہر اپنی کھاٹ پر ہی جمی رہتی تھی، وہ بھی بنتا کی چیخیں سن کر اپنے آپ کو روک نہیں پائی۔ اُسنے لاٹھی تھامی اور گرتے پڑتے سنتا کے کمرے تک پہونچنے کا جتن کرنے لگی۔ کمرے میں تو کہرام مچا ہوا تھا۔ ایک طرف پرمیت چھاتی پیٹ پیٹ کر رو رہی تھی اور دوسری طرف رانو چیخ چیخ کر ہلکان ہوئے جا رہی تھی۔ ان سب سے بے نیاز سنتا، بنتا کو پیٹتا چلا جا رہا تھا اور بار بار ایک ہی سوال پوچھے جا رہا تھا۔

''کھوتے دے پتر! بول کتھے مار چھڑیا میری گوری نو؟''

وہ رو رہا تھا اور مار کھائے جا رہا تھا۔ سنتا کے سر پر تو جیسے خون سوار ہو چکا تھا۔ پرمیت اور رانو اُسے قابو کرنے میں ناکام ہو چکی تھیں اسلئے وہ بے بسی اور لاچارگی کے عالم میں ایک طرف کھڑی ہو کر چھاتیاں پیٹ رہی تھیں۔ اتنے میں چاچی اندر آ گئی۔ اندر کا منظر دیکھ کر اُس کی بوڑھی ہڈیوں میں اُبال آ گیا۔ وہ خشم ناک ہو کر سنتا کی طرف بڑھی اور پھر اُس پر تابڑ توڑ لاٹھی برسانے لگی۔ سنتا اس اچانک یلغار سے ہکا بکا رہ گیا۔ چاچی زخمی شیرنی کی طرح دہاڑنے لگی۔

''ہائے ہائے مر جانیا۔ ایک گائے کے واسطے منڈے نو مار ڈالے گا کیا؟''

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

سنتا مار کھا کے پیچھے ہٹ گیا۔ بنتا جو چار چوٹ کی مار کھانے کے بعد ادھ موا سا ہو گیا تھا بمشکل تمام اُٹھا اور بھاگ کر ماں کے پیچھے جا کر چھپ گیا۔ سنتا لاٹھی کھا کے بچوں کی طرح پھپھک پھپھک کر رونے لگا۔ چاچی نے اُسے سہارا دیا، اُسے سینے سے لگایا اور پھر اُسے سمجھا بجھا کر کمرے سے باہر لے گئی۔

سنتا گوری کے کھو جانے کے بعد بجھا بجھا سا رہنے لگا۔ اُسے آٹھوں پہر گوری کی یاد ستاتی رہتی تھی۔ جب سے اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ گوری سرحد کے اُس پار چلی گئی ہے وہ سوتے میں ہڑ بڑا کر اُٹھتا تھا اور پھر گوری کو یاد کر کے سسکنے لگتا تھا۔ شوہر کی اس روز روز کی اشک شوئی سے پرمیت کا کلیجہ پک چکا تھا۔ جب دیکھو سوکھا سا منہ لئے بیٹھا ہے۔ نہ کسی سے ہنسی نہ ٹھٹھول۔ وہ دل ہی دل میں گوری کو کوستی رہتی تھی جو سوت بن کر اُس کی زندگی میں در آئی تھی۔ سنتا رات کو ہوتا تھا پرمیت کے ساتھ مگر اس کے دل و دماغ میں گوری بسی ہوئی ہوتی تھی۔ اُس کی ذہنی کیفیت کا یہ عالم تھا کہ کہو دن کی سنے رات کی۔ اس کی ذہنی افراتفری اور پراگندگی کو دیکھ کر پرمیت اپنا من مسوس کر رہ جاتی تھی۔ اُسنے اُس کے من کو کئی بار ٹٹولا۔ دل کو کھنگالا کہ پتا چلے کہ آخر اُس کے اندر کیا ٹوٹ پھوٹ چل رہی ہے۔ کون سی بات اُسے اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے پر وہ نہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے۔ جب پرمیت کو اُس کے سر پڑ گئی تو ایک دن اُسنے پرمیت کو اپنی فکر و تشویش سے آگاہ کر دیا جو اُسے رات دن کھائے جا رہی تھی۔ اُسے اس بات کا ملال نہ تھا کہ گوری کہیں گم ہو گئی ہے۔ اُسے اس بات سے بھی کوئی دکھ نہیں ہوتا اگر کوئی اُس سے یہ کہتا کہ گوری مر گئی ہے۔ اُسے اگر غم تھا تو اس بات کا کہ گوری جن لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی ہے وہ اُسے جینے نہیں دیں گے بلکہ کسی بے رحم چھرے سے اُسے ذبح کر ڈالیں گے۔ بس یہ خیال اُسے رنجیدہ اور پریشان کئے جا رہا تھا۔ اُسنے گوری کو بڑے جتن سے پالا تھا اسلئے اُسے اُس کا یہ انجام منظور نہ تھا۔ اس انجام کے احساس سے ہی اُس کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا تھا۔ گوری کی یاد اُسے لہولہو رلا دیتی تھی۔ اب جب کہ پرمیت پر یہ باعث کھلا تھا کہ سنتا گوری کے لئے اتنا دکھی اور پریشان کیوں ہے تو ایک دن وہ اُسے سمجھاتے ہوئے بولی۔

"یہ بے فجول کی گلاں سوچنا چھڑ دو جی۔ جس طرح برے چنگے بندے اتھے رہندے ہیں اسی طرح اُس پار بھی کچھ بھلے چنگے بندے ہونگے۔ کے پتا ساڑھی گوری ایسے کسی چنگے بھلے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بندے کے ہتھ لگی ہو۔ ویسے ایک گل دسوں۔ ساڑھی گوری ہے اینی سندر کہ کوئی اُسے مار ڈالنے کی کدی سوچ بھی نہیں سکدا۔ واہگورو پر پروسا رکھو۔ گوری جتھے بھی ہوگی بھلی چنگی ہوگی۔"

پرمیت کے دم دلاسے نے مرہم کا کام کر دیا۔ سنتا کے بے چین دل کو تھوڑا سا قرار مل گیا البتہ اُسکے دل سے وہ ڈر پوری طرح سے خارج نہ ہوا تھا جو اُس کیاندر گھر کر چکا تھا۔ پرمیت بھی اتنی جلدی ہار ماننے والی نہ تھی۔ وہ دھیرے دھیرے اُسکے دل و دماغ میں نئی اُمیدیں جگاتی چلی گئی۔ آہستہ آہستہ سنتا رنج و غم کے اُس خول سے باہر آنے لگا جسمیں اُس نے اپنے آپ کو قید کر کے رکھا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ایک سال بیت گیا۔ زندگی نے پھر سے رفتار پکڑ لی تھی۔ ایک شام جب وہ سبھی آنگن میں کھٹیا ڈال کے بیٹھے تھے کہ دفعتاً ایک دھماکہ ہوا۔ کسی نے پھاٹک پر اتنی زور کی ٹھوک ماری کہ کنڈی کہیں دور جا کے گری اور پھاٹک کھل گیا۔ پھاٹک کھلتے ہی ایک معجزہ ہو گیا۔ گوری اپنے بچھڑے کے ساتھ دم اُٹھائے دندناتے ہوئے اندر آ گئی۔ ایک پل کے لئے سب دم بخود ہو کر رہ گئے۔ ایسا لگا جیسے وہ کھلی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہے ہوں۔ سنتا پھٹی پھٹی آنکھوں سے گوری کی طرف دیکھنے لگا۔ گوری اپنے لوگوں کو دیکھ کر دم اُٹھائے کودنے پھاندنے لگی۔ کدکڑے مارنے لگی۔ سبھی لوگ خوشی سے اُچھل کر گوری کی طرف لپکے اور پھر اُسے چومنے چاٹنے لگے۔ سنتا جو ابھی تک حیران و ششدر ہو کے بیٹھا تھا، ایکدم اپنی کھاٹ چھوڑ کر گوری کی طرف بڑھا اور پھر اُس کے گلے سے لگ کر رونے لگا۔ گوری بھی جواب میں اُس کے سر کو چاٹنے لگی۔ سنتا بہت دیر تک اُسے چومتا چاٹتا رہا اور پھر دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا کر بولا۔

"واہگورو تیرا لکھ لکھ شکر ہے۔ تو نے میری گوری مینوں لوٹا دی۔ پرمیتے تو سچ ہی کہندی تھی کہ چنگے بھلے لوک ہر جگہ ہوندے ہیں۔"

سبھی خوشی سے جھوم رہے تھے۔ چاچی پریتم کور بھی گوری کو دیکھ کر اسقدر ترنگ میں آ گئی کہ وہ بغیر کسی سہارے کے کھٹیا چھوڑ کے نیچے آ گئی اور بچوں کے ساتھ بھانگڑا کرنے لگی۔ پرمیت تو گوری کو بار بار جھپیاں ڈال رہی تھی۔ جونہی وہ ایکطرف ہٹ گئی تو اچانک سنتا کی نظر گوری کے پیچھے چھپے ہوئے بچھڑے پر پڑی۔

بچھڑے کو دیکھ کر ایکدم اُس کے تیور بدل گئے۔ آنکھیں نیلی پیلی ہونے لگیں۔ وہ بچھڑے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کی طرف تیوریاں چڑھاتے ہوئے بولا۔

''پرمیتے! یہ حرامی دا پتر کتھوں آ گیا؟''

پرمیت بچھڑے کی طرف وارفتگی سے دیکھ کر بولی۔ ''آیا کتھوں۔ یہ اسی دا جنا ہے جی۔'' کہہ کر وہ اُسے پیار کرنے لگی۔

سنتا کے تن بدن میں آگ لگی۔ وہ غصے سے اُبل کر بولا۔ ''یہ اتھے نہیں رہ سکدا۔ یہ دشمن کا پلا میرے کاروچ کدی نہیں رہ سکدا۔''

پرمیت اور چاچی پہلے تو دم بخود رہ گئے۔ پھر اُنہوں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی مگر اُس نے کسی کی ایک نہ سنی۔ حد تو تب ہو گئی جب وہ ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا لے کر بچھڑے کو بھگانے لگا۔ پرمیت کور اُسے روکتے ہوئے بولی۔ ''یہ تو سی کی کر رہے ہو جی؟ اسے کتھے بھگا رہے ہو۔ یہ ساڑی گوری دا بچھڑا ہے۔ یہ اتھے نہیں رہے گا تو پھر کتھے رہے گا؟''

''جتھے مرضی ہو اُتھے رہے پر میں اس حرام دی اولاد کو اپنے کاروچ کدی رہنے نہیں دوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ اُسے لاتیں مار کر اور کان پکڑ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا صحن سے باہر کھدیڑنے لگا۔ اب کے گوری بے چین و بے قرار ہونے لگی۔ وہ پاگلوں کی طرح ادھر اُدھر ایسے دوڑنے لگی جیسے وہ سب کے سامنے فریاد کرنا چاہتی ہو۔ وہ کبھی خشم سے پرمیت کی طرف دیکھتی تو کبھی سنتا پر غصہ کرنے لگتی تھی۔ سنتا اُس کے غصے اور ناراضگی کی پرواہ کئے بنا بچھڑے کو گھر سے باہر کھینچتے ہوئے لے گیا۔ اسنے باہر سے دروازہ بند کر دیا تا کہ گوری بچھڑے کے پیچھے نہ چلی آئے۔ وہ اُسے کھینچتے کھانچتے بورڑر کی طرف لے گیا اور لاٹھیاں مار مار کر اُسے سرحد کی اُس اور دھکیلنے لگا جہاں سے وہ آیا تھا۔ بچھڑا مار کھا کے بے سدھ ہو کے بیٹھ گیا۔ اس بیچ اندھیرا ہو گیا۔ سنتا چین کی سانس لے کر گھر لوٹا۔

گھر پہونچا تو کیا دیکھا کہ گوری اُداس اور غمگین ہو کے ٹکٹکی باندھے دروازے کی اور دیکھ رہی ہے۔ اس کے سامنے ہری ہری گھاس پڑی تھی جسے وہ منہ تک نہیں لگا رہی تھی۔ اُسے تو بس اپنے بچھڑے کے لوٹ آنے کا انتظار تھا۔ سنتا نے سوچا کہ ایک دو دن میں گوری اپنے بچھڑے کو بھول جائے گی۔ وہ یہی سوچ کر رات کا کھانا کھا کے سو گیا۔ بھور کا وقت تھا کہ صحن میں دھڑام دھڑام کی آوازیں آنے لگیں شور سن کر سبھی جاگ گئے۔ سنتا معاً اُٹھا اور وہ بھاگ کر نیچے چلا گیا۔ نیچے جا کر اُسنے کیا دیکھا کہ گوری پھاٹک پر زور زور سے سر پٹخ رہی ہے۔ سنتا نے پریشان ہو کر سرعت سے جو

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

دروازہ کھولا تو باہر کھڑا بچھڑا دوڑ کر اندر آ گیا اور جا کے ماں کے تھن چاٹنے لگا۔

بچھڑے کو دیکھ کر سنتا کا خون کھول اُٹھا۔ جی میں آیا کہ ابھی میان سے کرپان نکال کر بچھڑے کا سر قلم کر دے جو اُس کے صبر و ضبط کا امتحان لے رہا تھا۔ اُسنے جیسے تیسے سینے پتھر رکھ کر دن میں بچھڑے کو تو گوارہ کر لیا مگر شام ہونے سے پہلے ہی اُسنے گوری کو باندی خانے میں لوہے کی زنجیروں سے باندھ کے رکھ دیا۔ جونہی چراغ میں بتی پڑ گئی اُسنے بچھڑے کی آنکھوں پر پٹی باندھ لی اور اُسے گھسیٹتا ہوا بستی سے دور ایسی جگہہ لے گیا جہاں سے سرحد کی دوری محض دو ہاتھ تھی۔ وہاں پر پہونچ کر اُسنے پہلے بچھڑے پر جھونجھل اُتارتے ہوئے اُسے خوب مارا پیٹا اور پھر اُس کی پٹی کھول کر وہ وہاں سے کھسک گیا۔

وہ رات گوری کے لئے قیامت کی رات ثابت ہوئی۔ اُسنے ساری رات تڑپ تڑپ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں گزار دی۔ بس ہر پل، ہر لمحہ وہ لوہے کی زنجیر سے آزاد ہونے کی جدوجہد میں لگی رہی۔ کھونٹے سے لڑتے لڑتے اُس کی گردن چھل گئی تھی پھر بھی وہ کھونٹے سے زور آزمائی کرنے سے باز نہ آئی۔ کھونٹا بھی اتنی مظبوتی سے گڑا ہوا تھا کہ گوری لاکھ کوششوں کے باوجود اُسے اُکھاڑ پھینکنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ رات بھر یہ کشاکشی اور زور آزمائی چلتی رہی۔

صبح جب سنتا گوری کا منہ دیکھنے کے لئے باندی خانے میں گھسا تو گوری کی حالت دیکھ کر وہ اپنا من مسوس کر رہ گیا۔ گوری اپنے بچھڑے سے ملنے کے لئے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ سنتا کو دیکھ کر اُسنے ترحم اور فریاد بھری نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا اور پھر اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ سنتا نے آگے بڑھکر اُس کی گردن پر ہاتھ پھیرا اور اُسے پیار کرنے لگا تبھی اُس کی نظر اچانک دروازے پر کھڑی پرمیت پر پڑی جس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ سنتا نے بیوی کو اسطرح روتے دیکھا تو وہ اُس کی طرف لپکا اور سراسیمہ ہو کے اُس نے پرمیت سے پوچھا۔ ''اوئے تینوں کی ہوئیا۔ تو کاہے کو رو رہی ہے۔''

پرمیت نے خشمگیں نظروں سے سنتا کی طرف دیکھا اور پھر گوری کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

''گوری دی حالت دیکھ رہے ہو تو سی۔ کنی دکھی ہے بیچاری۔ تو سی اس دا درد کے سمجھو گے اس دا درد اک ماں ہی سمجھ سکدی ہے۔ مینوں اک گل دسو ایک ماں سے اُس دا لال الگ کر کے توڑا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کلیجہ نہیں پھٹا؟ ارے تو سی کیسے انسان ہو جسے ماں کی ممتا ذرا بھی پاس نہیں۔ آخر اُس معصوم نے توڑا کیا بگاڑا تھا جو تو نے اُسے اپنی ماں سے الگ کر دیا۔ ارے وہ تو ہون یہ بھی نہیں جاندا ہے کہ اپنا کون اور پرایا کون۔ بڑا جلم کیتا ہے تو نے اُس بے زبان نال۔ بڑا جلم کیتا ہے تو نے۔'' کہہ کر وہ پھر سے رونے لگی۔ سنتا ایک مجرم کی طرح سر جھکائے بیوی کی پھٹکار سنتا رہا۔ پرمیت کی باتیں تلخ و ترش سہی پر تھیں صداقت پر مبنی۔ آخر اُسے کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ ایک معصوم کو اپنی نفرت اور عداوت کا شکار بنا دے۔ وہ پرمیت سے نظریں چراتے ہوئے گوری کی طرف بڑھا اور پھر اُسے پیار کرتے ہوئے بولا۔

''تیرا بچھڑا تیرے قول واپس آ جائے گا۔ یہ سردار سنتا سنگھ دا وعدہ ہے تیرے نال۔'' کہکر اُسنے گوری کی گردن تھتھپائی اور پھر تیزی سے باندی خانے سے باہر چلا گیا۔ پرمیت کور جو ابھی تک دروازے پر کھڑی تھی، سنتا کے باہر جاتے ہی گوری کی طرف بڑھی اور پھر اُس سے لپٹ کر بولی۔

''حوصلہ رکھ گوری۔ حوصلہ رکھ۔ تیرا منڈا تیرے قول واپس آ جائے گا۔''

سنتا بچھڑے کو ڈھونڈنے اُس جگہہ پہونچ گیا جہاں اُسنے اُسے کل رات چھوڑا تھا پر یہ دیکھ کر وہ دھک سے رہ گیا کہ بچھڑا وہاں پر نہیں تھا۔ وہ تو سرحد کے اُس اور چلا گیا تھا جہاں سے اُسے واپس لانا اب اُس کے حدِ اختیار میں نہ تھا۔ وہ چوکی پر طعینات سنتری کے پاس چلا گیا اور اُسے سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ سنتری بھی اسی علاقے کا رہنے والا تھا۔ وہ سنتا کو بڑے پیار سے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''دیکھ پرا وہ دشمن دا علاقہ ہے۔ تو نے اگر اُس اور پاؤں بھی رکھ دیا نا تو وہ تم پر سیدھے گولی چلا دیں گے۔ دیکھ بچھڑے سے زیادہ تیری جان قیمتی ہے۔ دیکھ میری گل مان۔ بچھڑے کو بھول کر اپنے کار چلا جا۔ جا۔''

سنتا بڑا مایوس اور دل برداشتہ ہو گیا۔ اُس کی گوری کی ممتا کو کوئی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اُسنے سنتری کے آگے خوب آہ و زاری کی۔ اُس کے پاؤں پکڑے، رویا گڑگڑایا پر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر گوری کا بچھڑا نہ ملا تو وہ گوری کے سامنے کیسے جا پائے گا جو پتھرائی آنکھوں سے اپنے بچھڑے کا انتظار کر رہی ہوگی۔ وہ پرمیت کو کیا منہ دکھائے گا۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں پڑا رہا۔ اُدھر سنتا کے گھر والے سنتا کے لئے کافی فکرمند اور پریشان تھے۔ وہ صبح کا بھوکا پیاسا گھر سے نکلا تھا۔ اب تو شام بھی ہونے کو آئی تھی۔ سنتا ابھی تک گھر نہیں لوٹا تھا۔ جوں جوں وقت ڈھلتا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

گیا پرمیت کور کی تشویش بڑھنے لگی۔ اُس کا دل ڈوبا جانے لگا۔ من میں طرح طرح کے وسوسے اور اندیشے سر اُٹھانے لگے۔ وہ دل ہی دل میں سنتا کی صحت وسلامتی کی دعائیں مانگنے لگی۔

رات ہوئی تو سنتا ایک ٹیلے کے پیچھے سے نکلا جہاں وہ بہت دیر سے چھپا بیٹھا تھا۔ دراصل آج وہ یہ طے کر کے بیٹھا تھا کہ وہ بچھڑے کو لے کر ہی گھر لوٹے گا۔ وہ دھیرے دھیرے سانس روکے وہ پیٹ کے بل سرحد کی طرف رینگتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ وہ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا اسلئے اُس مقام تک پہنچنے میں اُسے کوئی دقت نہیں ہوئی جہاں پر بچھڑا بیٹھا تھا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا مگر سنتا کی دیوانگی اور لگن کا عالم دیکھئے کہ وہ سر پر کفن باندھ کر بچھڑے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ پتوں کی چرمراہٹ سے دونوں اطراف کے سنتریوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ اُنہوں نے اندھیرے کو جو ٹٹولا تو سنتا بھاگنے لگا۔ بس پھر کیا تھا۔ دونوں اطراف سے گھمسان چھڑ گیا۔ بہت دیر تک گولیوں کی آواز سے ماحول تھرا اُٹھا۔ یہ گولہ باری صبح تک جاری رہی۔

صبح جب پرمیت سنتا کی تلاش میں گھر سے باہر آ گئی تو وہ یہ دیکھ کر خوشی سے اُچھل پڑی کہ بچھڑا دروازے پر کھڑا تھا۔ پرمیت بے تحاشہ اُس کی طرف بڑھی اور اُس سے لپٹ کر اُسے پیار کرنے لگی۔ وہ اُس کے پیار میں ایسی ڈوبی ہوئی تھی کہ اُسے پتا ہی نہ چلا کہ اُس کے سامنے پولیس کی جیپ کب آ کے رکی۔ اُنہوں نے جونہی جیپ میں سے گولیوں سے چھلنی سنتا کی لاش نیچے اُتار دی تو پرمیت کی نظر اُس لاش پر پڑی۔ ایک پل کے لئے پرمیت کور جامد وساکت کھڑی رہی لیکن دوسرے ہی پل اُس کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی جو بہت دیر تک فضاؤں میں گونجتی رہی۔

■ ■ ■

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

باباجی

اُس کا اصلی نام محمد سلطان پرے تھا پر اس نام سے اُسے کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس علاقے میں وہ سولہ موت کے نام سے مشہور تھا۔ مزے کی بات تو یہ تھی کہ اُسنے بھی اس نام کو بڑی آسانی سے اپنے متھے سے لگا لیا تھا۔ موت دراصل ایک کشمیری لفظ ہے جو کسی خبطی سنکی، مست ملنگ یا کسی جلالی پیر فقیر کے لئے استمال کیا جاتا ہے۔ وہ نہ تو کوئی مست ملنگ تھا نہ کوئی جلالی پیر فقیر۔ وہ تو نرا پاگل تھا جو کبھی منہ سے کبھی لال اُگلتا تھا تو کبھی آگ۔ بظاہر وہ عام سا آدمی لگتا تھا۔ چہرے مہرے اور چال ڈھال سے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کوئی پاگل ہے۔ ویسے بھی پاگلوں کے سر پر سینگ تو نہیں ہوتے ہیں۔ وہ بس اُلٹی سیدھی حرکتوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ بھی دن بھر کبھی شانت رہتا تھا تو کبھی اُلٹی سیدھی حرکتیں کرتا رہتا تھا۔ اُس کی ان ہی اُلٹی سیدھی حرکتوں سے یہ بات عام ہو چکی تھی کہ وہ کوئی نارمل انسان نہیں ہے بلکہ ایک مخبوط الحواس آدمی ہے جسے یہ ہوش نہیں کہ وہ کر کیا رہا ہے اور کہہ کیا رہا ہے۔ وہ پل میں تولہ اور پل میں ماشہ تھا۔ دو چیزوں سے اُسے خدا واسطے کا بیر تھا۔ ایک گاؤں کے شریر اور نٹ کھٹ بچے اور دوم گلی محلے کے آوارہ کتے جو ہمیشہ اُس کی جان کے درپے رہتے تھے۔ وہ دن بھر بڈگام کے بازار میں ڈنڈے بجاتا پھرتا تھا۔ جب تک کوئی اُسے چھیڑتا نہیں تھا وہ ایک سلجھے اور شانت آدمی کی طرح برتاو کرتا تھا۔ وہ کہتے ہیں نا کہ دیوانہ را ہوئے بس است یعنی دیوانے کو چھیڑنے کے لئے ایک ہو کہنا ہی کافی ہے۔ ایک بار کوئی اُسے چھیڑتا تھا تو پھر وہ نہ عمر کا لحاظ کرتا تھا اور نہ ہی جنس کا۔ جو بھی سامنے ہوتا تھا وہ اُسے من بھر کی گالیاں دے دیتا تھا گالیاں بھی ایسی فحش اور ننگی جنہیں سن کر شیطان بھی پناہ مانگے۔ یہ اُس کی دہشت تھی یا اُس کے تئیں لوگوں کی عقیدت کہ اُس کی گالیوں کو بھی وہ تبرک سمجھ کر آنکھوں سے لگا لیتے تھے۔ اس گاؤں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کے لوگوں نے بھی ایسا ظرف پایا تھا کہ اُس کے ہاتھوں ذلیل ہونے کے باوجود کوئی بھی فرد اُس کے خلاف دل میں کسی قسم کا بغض یا کینہ نہیں رکھتا تھا۔

وہ پچھلے کئی سالوں سے یہاں رہ رہا تھا۔ اسی گاؤں کے ایک صاحب حثیت آدمی حاجی سبحان ڈار نے اُس پر ترس کھا کر اُسے ایک جھونپڑا بنوا کر دیا تھا جہاں وہ رات کو پاؤں پسار لیتا تھا۔ ایک دن اُس سے یہ بھول ہوئی کہ وہ اُسے دین داری کی باتیں سمجھانے لگا۔ بس پھر کیا تھا۔ وہ ایک پل میں اپنا آپا کھو بیٹھا اور پھر وہ دشنام طرازی پر اُتر آیا۔ حاجی اُس کے اس غیر متوقع برتاو سے دم بخود ہو کے رہ گیا۔ اُس کے اسی اڑیل اور سڑیل پن کی وجہ سے لوگ اُس سے خائف رہتے تھے۔

وہ کون تھا کہاں سے آیا تھا یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ برسوں پہلے ایک ٹھٹھرتی ہوئی صبح وہ اچانک اس بازار میں نمودار ہوا۔ اس کی حالت بڑی خستہ تھی۔ اُس کی ہیت کذائی بتا رہی تھی کہ وہ کئی دنوں سے بھوکا اور بیمار ہے۔ لوگوں نے اُسے آسرا دیا۔ دھیرے دھیرے وہ یہاں کے ماحول میں پیوست ہو کر رہ گیا۔ اُس کی اُلٹی سیدھی حرکتوں کے باوجود یہاں کے لوگوں نے اُسے پھٹ پھٹ دردر نہ کہا بلکہ اُسے سینے سے لگا لیا۔ وہ جس دوکان کے آگے کھڑا ہو جاتا تھا وہی دکان دار اُس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا رہتا تھا۔ وہ جس چیز کی فرمائش کرتا تھا وہ بغیر کسی چوں چرا کے اُس کے آگے رکھ دیتا تھا۔ اُسے نہ کھانے پینے کی سدھ تھی اور نہ پہناوے کی۔ ملا تو کھا لیا نا ملا تو نا سہی۔ یوں تو اُس کی دیکھ بھال کرنے والوں کی یہاں کوئی کمی نہ تھی۔ یہاں کے لوگ اُسے قسمت کا مارا سمجھتے تھے اور اُس کا ہر طرح سے خیال رکھتے تھے۔ وہ جس گھر میں گھستا تھا، گھر کے مکین اُسے سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ داماد کی طرح اُس کی خاطر تواضع کرتے تھے پر طرفہ تماشا دیکھئے کہ وہ جن کے گھر سے کھا پی نکلتا تھا باہر آ کے اُن کی ہی ایسی تیسی کر کے رکھ دیتا تھا۔ ایسا کم ظرف اور ناشکرا تھا وہ۔

اچانک کشمیر کے حالات بگڑ گئے۔ وادی تشدد کی ذد میں آ گئی۔ تشدد کے واقعات دیکھ کر سولہ موت باتیں کرنا ہی بھول گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اُس نے چپ شاہ کا روزہ رکھ لیا ہو۔ اب وہ کم کم ہی بازار میں گھومتے پھرتے دکھائی دیتا تھا البتہ وہ گاؤں سے لگے ٹیلے پر اکثر نظر آتا تھا جہاں وہ یا تو خود کلامی میں مصروف ہوتا تھا یا دہاڑیں مار مار کر رو دیا کرتا تھا۔ کوئی اُس سے کوئی سوال نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اُس سے سوال کرنا بھڑ کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا۔ چنانچہ جب کوئی اُس

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کے سامنے سے گزرتا تھا تو اُسے دیکھتے ہی وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتا تھا۔ یہ سوچکر کہ کہیں یہ پاگل اُسے لتے نہ لے لے۔ دراصل سولہ موت وادی میں ہو رہے خون خرابے سے کافی دکھی اور پریشان تھا۔ وہ جب بھی کسی کی گولیوں سے چھلنی لاش دیکھتا تھا تو وہ پہلے بلکنے لگتا تھا اور پھر بدحواس ہو کر زمین پر ڈنڈے برسانے لگتا تھا۔

ایک دن پاس کے گاؤں میں کچھ شر پسندوں نے اقلیتی فرقے کے چند مکانوں کا گھیراو کر کے پہلے ان مکانوں میں رہنے والے مکینوں کو گولیوں سے بھون ڈالا اور پھر اُن کے گھروں کو آگ لگا دی۔ پاس پڑوسی گولیوں کی آواز سن کر گھروں میں ہی دبک کر بیٹھ گئے لیکن جونہی آگ کے شعلے آسمان کو چھونے لگے تو وہ چیختے چلاتے گھروں سے باہر نکل آئے۔ باہر کا عالم دیکھ کر پہلے تو وہ سن رہ گئے اور پھر چھاتیاں پیٹ کر رونے لگے۔ محلے کی کچھ عورتیں یہ دلدوز منظر دیکھ کر غش کھا کر گریں۔

کشمیریوں نے ایسے خونیں مناظر اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ ایسے دلسوز مناظر دیکھ کر پتھر کا کلیجہ بھی پھٹ سکتا تھا۔ سولہ موت بھی بھلا کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔ وہ بھی گرتے پڑتے جائے واردات پر پہونچ گیا۔ وہاں کا حال دیکھ کر وہ مرغ بسمل کی طرح زمین پر لوٹنے لگا۔ اُس نے چھاتی پیٹ پیٹ کر اپنا برا حال کر دیا۔ جب اُسے بھی تسکین نہ ملا تو وہ اُٹھا اور بہت دیر تک زمین پر لاٹھیاں مارتے ہوئے مغلظات بکتا رہا۔ اُس کے بعد وہ وہاں سے ہلکان ہو کے روتا بلکتا ہوا چلا گیا۔

وہ شام بڑی بوجھل اور اُداس تھی۔ سولہ موت اپنے سینے میں درد و غم کا ایک طوفان چھپائے بھاری قدموں کے ساتھ گھر کی جانب لوٹ رہا تھا کہ اچانک چلتے چلتے وہ ایک جگہ ٹھٹھک کے رہ گیا۔ اُسنے کیا دیکھا کہ تین چار سال کی ایک پھول جیسی بچی ایک پتھر کے پیچھے بے سدھ پڑی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک انجانی سی چمک ہویدا ہوگئی۔ وہ بچی کی جانب بڑھنے لگا کہ دفعتاً اُس نے اپنے قدم روک لئے اور وہ شام کے سیاہ دھندلکوں کے پوری طرح سے پھیلنے کا انتظار کرنے لگا۔ چہار سو ہو کا عالم طاری تھا۔ دور دور تک نہ کوئی آدم نہ آدم زاد دکھائی دے رہا تھا۔ سولہ موت نے ڈرتے ڈرتے اپنے رکے ہوئے قدم آگے بڑھائے اور پھر اُس لڑکی کو یک ٹک دیکھنے لگا۔ اُسے تکتے تکتے نہ جانے اُس کی آنکھیں کیوں بھیگ گئیں۔ جی میں آیا کہ بڑھکر اس

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

لڑکی کو اپنی بانہوں میں بھر لے اور پھر اُسے اپنے سینے سے لگا لے۔ جونہی اُس نے بچی کی طرف اپنے ہاتھ بڑھائے پتا نہیں اُس کے ہاتھ پاؤں کیوں لرزنے لگے۔ کیوں اُس کا کلیجہ کانپ اُٹھا۔ اس سے پہلے کہ اُس کی ہمت ڈول جائے۔ اُس کے ارادے ڈگمگا جائیں اُس نے لڑکی کو لپک کر اپنی بانہوں میں بھر لیا اور پھر وہ اس لڑکی کو اپنے کاندھے پر ڈال کر گھوڑے کی طرح بگ ٹٹ دوڑنے لگا۔

وہ رات کے پہلے پہر اس لڑکی کو لے کر اپنے جھونپڑے پر پہونچا۔ بچی ابھی تک بے سدھ پڑی تھی۔ اُس نے بچی کو فرش پر ڈال دیا اور پھر اُسے ہوش میں لانے کے جتن کرنے لگا۔ پہلے اُس کے منہ پر پانی کا چھینٹا مارا۔ وہ نہیں اُٹھی۔ اُسنے دوبارہ یہی عمل دہرایا۔ اس بار اُس کی یہ ترکیب کامیاب رہی لڑکی نے دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں وا کیں۔ جونہی اُسنے آنکھیں پوری طرح کھول کے سولہ موت کو اپنے سرہانے کے پاس کھڑا پایا تو وہ ہڑبڑا کر اُٹھی اور پھر ڈر کے مارے چیخنے چلانے لگی۔ سولہ موت بدحواس ہو کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس سے پہلے کہ سولہ موت اُسے چپ کراپاتا وہ بھاگ کر ایک کونے میں جا کر چھپ گئی اور کن اکھیوں سے سولہ موت کو گھورتی رہی۔ دراصل سولہ موت کی شکل ہی اتنی بھیانک تھی کہ کوئی بھی اُسے دیکھ کر ڈر جاتا۔ یہ لمبی لمبی اُس کی کالی جٹائیں۔ یہ میلی چکٹ سی داڑھی۔ انگاروں کی مانند دہکتی اُس کی دو آنکھیں۔ یہ میلے کچیلے دانت۔ وہ منہ کھولتا تھا تو اُس کے منہ سے بدبو کے بھبکے باہر آتے تھے۔ گرم پٹو کا پھرن جو وہ برسوں سے پہنتا چلا آرہا تھا اُس پر تو لیرے لگ چکے تھے۔ چنانچہ وہ معصوم سی بچی پہلے سے ہی کافی خوفزدہ اور پریشان دکھائی دے رہی تھی ایسے میں سولہ موت کو دیکھ کر وہ اور زیادہ سہم گئی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے سولہ موت کو گھورنے لگی۔ سولہ موت بڑا مضطرب اور بے چین ہو اُٹھا۔ اُسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے وہ بس بہت دیر تک دم سادھے بت بنا بیٹھا رہا مبادا کہ لڑکی اور زیادہ خایف نہ ہو۔ وہ بس ایک دوسرے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ جب لڑکی زرا سی سنبھلی تو سولہ موت ہمت کر کے دھیرے دھیرے اُٹھا اور اُس نے طاقچے پر رکھا ایک سیب اُتار کر لڑکی کے سامنے رکھ دیا۔ لڑکی بہت بھوکی تھی۔ وہ کبھی للچائی آنکھوں سے سیب کو دیکھتی تو کبھی سہمی ہوئی نگاہوں سے سولہ موت کو گھورتی۔ چند لمحے تک آنکھ مچولی کا یہ کھیل چلتا رہا۔ جب وہ بھوک سے بے تاب ہوئی تو اُسنے سیب کی طرف ہاتھ بڑھا لیا اور سولہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

موت کی طرف مترحم نظروں سے دیکھنے لگی جیسے وہ اُس کے اشارے کی منتظر ہو۔ سولہ موت نے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی مسکراہٹ جادو کا کام کر گئی۔ اُسنے سیب کو اُٹھا لیا اور اُسے تیزی سے کھانے لگی۔ سولہ موت کی آنکھوں سے مارے خوشی کے آنسو چھلک پڑے اور وہ بھاگ کر بہت ساری چیزیں اُٹھا کر لے آیا اور اُس نے یہ ساری چیزیں لڑکی کے سامنے رکھ دیں۔ لڑکی اتنی ساری چیزیں دیکھ کر سب کچھ بھول گئی۔ وہ ان چیزوں پر ٹوٹ پڑی۔ سولہ موت بڑی وارفتگی سے اُس کی طرف یک ٹک دیکھتا رہا۔

دھیرے دھیرے وہ بچی جس کا نام بلی تھا سولہ موت کے ساتھ اس حد تک گھل مل گئی کہ اب وہ اُس کے بنا ایک پل بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ سولہ موت اُسے ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ منہ اندھیرے ہی گھر سے نکل جاتا تھا اور گھر گھر جا کر لوگوں سے کھانا مانگ کر لے آتا تھا۔ وہ جہاں بھی جاتا تھا ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتا تھا۔ کوئی رکنے کے لئے کہتا تو وہ حیلے اور بہانے بنا بنا کر وہاں سے کھسک جاتا تھا اور بلی کے جاگنے سے پہلے اُس کے پاس پہونچ جایا کرتا تھا۔ جب سے وہ سولہ موت کی پناہ میں تھی اُسنے اُسے باہر کی ہوا بھی لگنے نہ دی تھی۔ وہ دن بھر اُس کے ساتھ کھیلتا تھا۔ اُسے اپنے ہاتھوں سے نہلاتا دھلاتا تھا۔ اُس کی کنگھی چوٹی کرتا تھا پر اُسے لوگوں کی نظروں سے چھپا کے رکھتا تھا۔ اُسے ہر دم یہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ اگر کسی نے اس بچی کو دیکھ لیا تو وہ اسے اُس سے چھین کر لے جائیں گے اور اُسے پھر وہی بھٹکلا ور تنہا زندگی گزارنی پڑے گی۔ پھر وہی رات کی سیاہی اُس کے لئے غم واندوہ کی سوغات لے کر آیا کرے گی اور پھر اُسے ہر پل درد کے انگاروں پر لوٹنا پڑے گا۔

بلی کے آنے سے سولہ موت کی زندگی میں ایک طوفانی بدلاو آ گیا تھا۔ اب وہ بازار میں بہت کم دکھائی دیتا تھا۔ اس سے پہلے اُس کے لئے جینے کا کوئی مطلبنہ تھا۔ بلی کے مل جانے سے اُسے ایک مقصد مل گیا تھا۔ بلی اپنی توتلی زبان سے اُسے وہ خونریز داستان سناتی تھی جب اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس کے ماں باپ اور بھائی بہن کا قتل کیا گیا تھا۔ دراصل پچھلے دنوں جس خاندان کا صفایا کیا گیا تھا اُس میں واحد یہی لڑکی بچی تھا۔ پاس پڑوسی اور رشتہ دار تو یہی سمجھ کے بیٹھے تھے کہ اُس کنبے کا کوئی نام لیوا رہا نہیں۔ پولیس کی رپورٹ بھی اس بات کی تصدیق کرتی تھی مگر یہ بات کوئی نہیں جانتا تھا کہ نفرت اور دہشت کی اس زہریلی فضا سے دور ایک بچی پیار و محبت

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کے آغوش میں پل رہی ہے اور پالنے والا ایک نارمل انسان نہیں بلکہ ایک پاگل ہے۔ نرا پاگل۔

شومئی قسمت ایک دن اس گاؤں کے گڑریے علی چوپان نے سولہ موت کو صبح صبح ببلی کی چوٹی بناتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے فوراً جا کر پولیس اسٹیشن میں خبر کر دی۔ پولیس نے بڑی مستعدی دکھائی۔ انسپکٹر جاوید نے بغیر کسی تاخیر کے چار چھ سپاہیوں کو ساتھ لے کر سولہ موت کے گھر واپر ہلہ بول دیا اور ببلی کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ سولہ موت ہڑبڑاہٹ میں پہلے کچھ سمجھ نہیں پایا لیکن جیسے ہی پولیس ببلی کو لے جانے لگی سولہ موت پر یکا یک وحشت طاری ہو گئی اور پھر اُس نے غضب ناک ہو کر ایک ڈنڈا اُٹھایا اور پھر وہ قہر بن کر پولیس والواں پر ٹوٹ پڑا۔ جب تک وہ لوگ سنبھل پاتے تب تک اُن پر بے بھاو کی پڑی تھی۔ سولہ موت نے پیٹ پیٹ کر اُنہیں لہولہان کر کے چھوڑا تھا۔ چنانچہ جب وہ مار کھا کے زرا سا سنبھلے تو وہ سولہ موت پر ایسے پل پڑے جیسے وہ انسان نہ ہو بلکہ کوئی باولا کتا ہو۔ جس کے ہاتھ میں جو آیا وہ اُس سے سولہ موت کو مارنے پیٹنے لگا۔ اُنہوں نے مار مار کے اُس کی حالت پتلی کر دی۔ چار چوٹ کی مار کھانے کے بعد سولہ موت ڈھیر ہو گیا وہ اُس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر گاڑی تک گھسیٹتے ہوئے لے گئے اور پھر اُسے گاڑی میں کاٹھ کباڑ کی طرح اُٹھا کر پٹخ دیا۔ اس بیچ ببلی طائر بسمل کی طرح اپنے پر پھڑ پھڑاتی رہی، چیختی چلاتی رہی پر کسی نے اُس کی آہ و بکا پر کوئی دھیان دیا ہی نہیں۔ وہ بلک بلک کر اپنے بابا کو آواز دے رہی تھی۔

سولہ موت کو تو پاگل خانے میں بھیج دیا گیا جب کہ ببلی کو تھانے میں ہی رکھا گیا۔ اُس کے رشتہ داروں کو خبر کر دی گئی۔ اُس کا ایک ماما تھا جو وادی چھوڑ کے نہیں گیا تھا بلکہ بڈگام میں ایک کرایے کا مکان لے کے رہ رہا تھا۔ ببلی کو دیکھ کر وہ خوشی سے پھولے نہیں سمایا۔ وہ اس کے زندہ بچ جانے کو ایک معجزے سے تعبیر کر رہا تھا۔ پولیس نے بچی کو اُس کی تحویل میں دے دیا۔ جب اُس کا ماما اُسے گود میں اُٹھانے لگا تو وہ مٹی کی مورت سی بنی رہی۔ نہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے۔ بس وحشت بھری آنکھوں سے وہ آنے جانے والوں کو تک رہی تھی۔ جب وہ اُسے اُٹھا کر لے جانے لگا تو وہ چیخ چیخ کے رونے لگی اور باباجی کے پاس جانے کی ضد کرنے لگی۔ ماما نے اُسے چپکرانے کی انتھک کوشش کی مگر وہ مسلسل روتی رہی۔ گھر پہونچ کر بھی اُس کا رونا بند نہ ہوا۔ یہی نہیں۔ جب وہ اُسے ایک کمرے میں چھوڑ کر کسی کام سے باہر چلے گئے تو وہ پیچھے سے اُڑن چھو ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اُس کے ماما نے اُسے بھاگتے ہوئے پکڑ لیا نہیں تو وہ اُن کے ہاتھ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

سے نکل گئی ہوتی۔ اُس کے یہ اطوار دیکھ کر اُنہوں نے اُسے ایک کمرے میں قید کر کے رکھنے میں ہی عافیت سمجھی۔

ببلی رو رو کے ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔ وہ اُسے پچکارتے، اُسے پیار کرتے۔ ڈھیر ساری چیزیں لا کر اُس کے سامنے رکھ دیتے تھے۔ وہ ان چیزوں کی طرف دیکھتی بھی نہیں تھی۔ بس ایک ہی رٹ لگا کے بیٹھی تھی کہ اُسے باباجی کے پاس لے چلو۔ اُس کے ماما پیارے لال کو اُس کی یہ حالت دیکھ کر تشویش ہونے لگی تھی۔ اُسے منانیکی کوئی بھی کوشش اب تک بار آور ثابت نہ ہو پائی تھی۔ بھوک پیاس سے اُس کی حالت بگڑتی چلی جا رہی تھی۔ وہ اُسے نہ یوں مرتے دیکھ سکتے تھے اور نہ ہی اُسے اُس پاگل کے حوالے کر سکتے تھے۔ وہ کیا کریں اُنہیں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُن کے پاس بس ایک ہی معصوم سی اُمید بچی تھی کہ آج نہیں تو کل وہ بھوک پیاس کی شدت سے ٹوٹ جائے گی اور پھر اُس کے دماغ سے باباجی کا بھوت خود بخود اُتر جائے گا پر ایسا نہ ہوا۔ وہ بھی بڑی سخت جان نکلی۔ دو دن تک اُس کے منہ میں ایک کھیل اُڑ کے نہیں گئی۔ ماما زبردستی اُس کے منہ میں نوالہ ٹھونس دیتا تھا تو وہ واپس اُس کے منہ پر اُگل دیتی تھی۔ اُس کی ضد کے آگے ماما بھی ہار گیا۔

اُدھر سولہ موت کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اور اُسے بجلی کے شاک پہ شاک دئے جا رہے تھے۔ اُس کے ہونٹوں پر فقط ایک ہی نام تھا جس کا وہ ورد کئے جا رہا تھا۔ پیہم بجلی کے شاک ٹریٹمنٹ دینے کے باوجود وہ اپنی ببلی کو بھلا نہیں پایا تھا۔ جب اُس کی حالت خستہ ہونے لگی تو اُسے منٹل ہاسپٹل سے آزاد کر دیا گیا۔ وہ جب اسپتال سے باہر آ گیا تو وہ کافی نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنی بھوک و پیاس اور اپنی کمزوری کی پرواہ کئے بنا اپنی ببلی کی تلاش میں نکل پڑا۔ اُسنے بستی کا چپہ چپہ چھان مارا پر اُسے ببلی کہیں نہ ملی۔ وہ اُس کی کھوج میں مارا مارا پھرتا رہا۔ آتے جاتے لوگوں سے اپنی بچی کے بارے میں پوچھتا رہا پر ہر کسی نے نفی میں ہی جواب دیا۔ چلتے چلتے اُس کے پاؤں میں چھالے پڑنے لگے مگر وہ اپنے تکلیفوں سے بے پرواہ اور بے نیاز اپنی مہم میں جٹا رہا۔ اُس نے اپنی تلاش ترک نہ کی بلکہ وہ اور زیادہ شدومد کے ساتھ اپنی بچی کو تلاش کرتا رہا۔

آخر ایک دن اُس کی یہ کڑی محنت رنگ لائی۔ ببلی کھڑکی پر سر نہوڑے بیٹھی تھی کہ اچانک سولہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

موت کی آواز اُس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ خوشی سے اُچھل پڑا اور بے تحاشہ دروازے کی اور بھاگنے لگی۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ پیارے لال جو کھڑکی سے اُس کی اس تڑپڑاہٹ کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ وہ درازے کو زور زور سے پیٹنے لگیا اور اپنے بابا کو رو رو کر پکارنے لگی۔ اب کے پیارے لال سے رہا نہ گیا۔ اُس نے جا کر باہر سے دروازے کی کنڈی کھول دی۔ جونہی دروازہ کھل گیا تو وہ کمان میں سے تیر کی طرح نکل گئی۔ پیارے لال بڑی بے بسی سے کھڑا دیکھتا رہ گیا۔ وہ بھاگ کر سولہ موت کے پاس پہونچی۔ سولہ موت اُسے دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو اُٹھا۔ اُسنے اُسے بانہوں میں بھر لیا اور پھر اُسے کاندھے پر بٹھا کر وہ پاگلوں کی طرح ناچنے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر پیارے لال کی آنکھیں بھر آئیں۔

سولہ موت اپنی بلی کو لے کر چلا گیا۔ اُس کے جاتے ہی پیارے لال کی بیوی اپنے شوہر پر چڑھ بیٹھی۔ وہ اپنے شوہر سے اس بات پر شاکی اور نالاں تھی کہ اُسنیا پنی بھانجی کو ایک پاگل کے ساتھ جانے کیسے دیا۔ پیارے لال نے اُسے اپنے سامنے بٹھایا اور پھر اُسے منطقی انداز میں سمجھاتے ہوئے بولا۔

"کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جن کا تعلق دل سے نہیں بلکہ براہ راست آتما سے ہوتا ہے۔ یہ دونوں بھی آتما کے بندھن سے بندھے ہیں۔ اگر تم شریر کو آتما سے الگ کر دو گی تو کیا وہ شریر زندہ رہ پائے گا۔ تم بن کی چڑیا کو سونے کے پنجرے میں قید کر کے رکھو گی تو کیا وہ اُس پنجرے میں جی پائے گی؟ نہیں وہ تڑپ تڑپ کے مر جائے گی۔ یہ بھی اُسی بن کی چڑیا کی طرح ہے۔ ہم اسے زیادہ دنوں تک قید نہیں رکھ سکتے تھے کیونکہ وہ اس قید خانے میں زیادہ دنوں تک جی نہیں پاتی اسلئے میں نے اُسے اس پنجرے سے آزاد کر دیا۔ رہی اس پاگل کی بات تو میری ایک بات گرہ میں باندھ لو۔ وحشی سے وحشی جانور بھی ممتا نبھانا جانتا ہے۔ یہ تو پھر بھی انسان ہے یہ آدمی دوسروں کے لئے پاگل ہو سکتا ہے مگر بلی کے لئے یہ ایک شفیق باپ اور ایک ممتا بھری ماں کا فرض اکیلے ہی نبھائے گا۔ یہ محض میری خوش فہمی نہیں بلکہ یہ میرا اٹل یقین ہے۔"

پیارے لال کی بیوی چپ چاپ شوہر کی باتیں سنتی رہی۔ وہ جواب میں کچھ نہیں بولی۔ وہ بس کئی طرح کے فکر و اندیشوں میں ڈوبی رہی۔

سولہ موت اب آزاد تھا۔ اب اُسے کسی کا ڈر نہیں تھا۔ جس بات کو وہ اب تک چھپانے کی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کوشش کر رہا تھا وہ تو اب جگ ظاہر ہو گئی تھی اسلئے اب وہ بے خوف صبح سویرے ہی بلی کو لے کر مندر میں پہونچ جایا کرتا تھا۔ خود باہر سیڑھیوں پر بیٹھ جایا کرتا تھا اور اُسے مندر کے اندر بھیج دیتا تھا۔ وہ اُس کی آستھا، اُس کے یقین پر اپنی مرضی لادنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اُس کی ہر خوشی کا خیال رکھتا تھا۔ بازار سے وہ اُس کے لئے ایک سے ایک کپڑا خرید کر لاتا تھا۔ یہ بات اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ وہ ایک ہندو لڑکی کو دل و جان سے پال رہا تھا۔ لوگ اُس کے اس جذبے کو تحقیر بھری نگاہ سے نہیں بلکہ تحسین بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔ وہ اُس کی ہر طرح سے مدد کرتے تھے۔ بلبلیبھی اب بڑی ہو رہی تھی۔ وہ اُسے اُنگل اُنگل بڑی ہوتے دیکھ کر پھولے نہیں سما رہا تھا۔ وہ ہر آستانے پر جا کر اُس کے نام کا دھاگہ باندھ کر آتا تھا۔ ایک طرف جہاں ذیشعور انسانوں کے ہاتھوں انسانی رشتوں کی پامالی ہو رہی تھی وہیں دوسری طرف ایک باورا انسانی رشتوں کے تقدس کو بحال کر رہا تھا۔ ایک طرف جہاں نفرت کے بیج بوئے جا رہے تھے وہیں دوسری طرف ایک دیوانہ پیار محبت کی بیلا کو اپنے خون جگر سے سینچ رہا تھا۔ عام لوگ اب بھی یہی مانتے تھے کہ وہ پاگل ہے پر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو یہ کہتے تھے کہ وہ پیار و محبت کا بھوکا ہے۔ وہ انسانیت کا پرستار ہے۔ وہ اعلیٰ قدروں کا پاسدار ہے۔ وہ اُخوت و بھائی چارے کا علمبردار ہے۔

بلبلی بہت ہی خوبصورت تھی۔ اُس کی خوبصورتی کے چرچے ادھر اُدھر پھیلنے لگے تھے۔ گاؤں کے آوارہ لونڈے آتے جاتے بلبلی کو چھیڑا کرتے تھے۔ بلبلی اسڈر سے اپنے باپ سے شکائیت نہیں کرتی تھی کہ اگر اُس کے کان میں یہ بات پڑ گئی تو وہ کشتوں کے پشتے لگا دے گا۔ کشن لال نامی جموں کشمیر پولیس کا ایک سپاہی اسی علاقے میں ڈیوٹی دے رہا تھا۔ کشمیری پنڈت ہونے کے ناطے وہ ایک دن بلبلی سے ملا اور اُسے اس بات کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ وہ یہ علاقہ چھوڑ کر جموں چلی جائے کیونکہ حالات دن بہ دن بگڑتے ہی چلے جا رہے تھے اور ایسے میں اُس کا یہاں رہنا جھوکھم بھرا تھا۔ وہ ابھی یہی باتیں کر رہے تھے کہ اچانک سولہ موت کمرے میں وارد ہوا۔ کشن لال کو دیکھ کر اُس کی آنکھیں لال پیلی ہونے لگیں۔ اس سے پہلے کہ سولہ موت کوئی ہنگامہ کھڑا کر دے بلبلی نے اُسے سمجھایا کہ وہ وہ اُس کی ذات برادری کا آدمی ہے اور وہ اُن کے بھلے کے لئے ہی یہاں آیا ہے۔ جب اُس کا شک و شبہ دور ہوا تو کشن لال نے سولہ موت کو پیش آئندہ خطرات سے آگاہ کر دیا۔ سولہ موت تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہا اور پھر وہ کشن لال کی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اچانک ایک انوکھی سی چمک اُس کی آنکھوں میں لہرانے لگی۔ اُسے ببلی کے لئے ورمل چکا تھا۔ اُسنے پہلے کشن لال کے دل کو ٹٹولا پھر اُس سے جب ببلی سے شادی کرنے کی پیشکش کی تو وہ فوراً تیار ہو گیا۔

اُسی رات دو بندوق برداروں نے ببلی کو اُٹھانے کی کوشش کی۔ سولہ موت جس کے ہوتے ہوئے آج تک کوئی ببلی کو ایک نگاہ دیکھنے کی ہمت نہیں کر پایا تھا آج وہ اپنی بیٹی کی عزت پر آنچ کیسے آنے دیتا۔ وہ اُن بندوق برداروں پر بھوکے بھیڑیوں کی مانند ٹوٹ پڑا اور تب تک اُن پر لاتوں اور گھونسوں سے وار کرتا رہا جب تک وہ چت ہو کے نہ گرے۔ سولہ موت نے جس طرح اُن پر اچانک یلغار کیا تھا ایسے میں اُنہیں ہتھیار نکالنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا اور وہ سولہ موت کے ہاتھوں مار کھا کر ڈھیر ہو گئے۔ جب وہ زرا سا سنبھلے تو وہ ہمت کر کے بھاگنے کی کوشش کرنے لگے۔ بھاگتے ہوئے اُنہوں نے سولہ موت پر ایک فائر کر دیا۔ وہ گولی کھا کر زمین پر گرا۔ باپ کی حالت دیکھ کر ببلی چیخنے چلانے لگی۔ اُس کی چیخ و پکار سن کر لوگ گھروں سے باہر نکل آئے اور اُنہوں نے گھائل سولہ موت کو اسپتال پہونچا دیا۔ اتنے میں یہ خبر سن کر کشن لال بھی اسپتال پہونچا۔ سولہ موت جیسے کشن لال کے انتظار میں ہی بیٹھا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی اُس نے اُسے اپنے پاس بلایا اور پھر اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر جذباتی ہو کے بولا۔ ''مجھے ایک قول دو۔ قول دو مجھے کہ تم آج کے آج میری بیٹی سے شادی کرو گے''

کشن لال تو شادی کے لئے راضی تھا البتہ ببلی تیار نہ تھی۔ وہ کوئی نہ کوئی حیلے حوالے سے یہ شادی روکنا چاہتی تھی لیکن سولہ موت قبر کا منہ جھانک کر آیا تھا۔ وہاب ببلی کو کسی کے پلے باندھ کر اس بندھن سے آزاد ہونا چاہتا تھا۔ اُسنے پہلے ببلی کو پیار سے سمجھانے کی کوشش کی۔ جب وہ نہ مانی تو اُس نے کھڑکی سے کود کر جان دینے کی دھمکی دی۔ دھمکی اثر کر گئی اور ببلی نے شادی کے لئے حامی بھری۔ اُسی رات برادری کے چند لوگوں کی دیکھ ریکھ میں ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ سولہ موت تو اسا حساس سے ہی پھولے نہیں سما رہا تھا کہ آخر کار اُس کی بیٹی اپنے گھر چلی گئی۔ ساتھ ہی اس خیال سے بھی اُس کا کلیجہ منہ کو آ رہا تھا کہ اُس کی بچی اب اُس سے جدا ہو گئی ہیوہ ان ہی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک اسپتال کے اس چھوٹے سے وارڈ کا دروازہ دھڑ لے سے کھلا اور ببلی دوڑ کر اندر آ گئی اور جا کر سیدھے سولہ موت سے لپٹ گئی۔ سولہ موت اُسے دیکھ کر سکتے میں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

رہ گیا۔ وہ سولہ موت سے لپٹی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور ساتھ ہی اُس سے کہہ رہی تھی۔

''میں تیرے بنا رہ نہیں پاؤں گی بابا۔ مجھے اپنے قدموں میں ہی پڑے رہنے دو۔ بابا مجھے اپنے آپ سے الگ مت کرو۔''

سولہ موت کو جیسے بجلی کا کرنٹ چھو گیا۔ وہ برافروختہ ہو کے اُٹھا اور ایک زناٹے کا تھپڑ اُس کے گال پر رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر دور جا گری۔ وہ اس غیر متوقع برتاو سے ایکدم سناٹے میں رہ گئی تھی۔ سولہ موت شعلہ بار نظروں سے اُسے گھور رہا تھا۔ وہ اُس کی طرف نفریں بھری نگاہوں سے دیکھ کر چلایا۔

''کیوں آئی ہو تم یہاں۔ کیا لگتا ہوں میں تمہارا۔ تھوڑے دنوں کے لئے اپنے ساتھ کیا رکھا تم تو مجھ کو اپنا غلام سمجھنے لگی۔ ارے جاو یہاں سے۔ چلی جاو۔ کیوں میری زندگی اجیرن کر دینا چاہتی ہو۔ دوبارہ میرے سامنے آ گئی نا تو یاد رکھنا مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ جاؤ دفا ہو جاؤ یہاں سے، جاؤ۔''

ببلی سن ہو کے کھڑی تھی۔ اُسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی بابا ہے جو اُس کی ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ آج یہ اچانک اسے ہو کیا گیا۔ اُس کی باتیں اُس کے دل و جگر پر کٹاری کی طرح چلنے لگیں۔ اُس کی ایک ایک بات اُسے لہولہو رلانے لگی۔ وہ بغیر کچھ کہے سنے وہاں سے نکل گئی۔ اُس کے جاتے ہی سولہ موت تکیے میں منہ چھپا کر پھپھک پھپھک کر رونے لگا۔ ڈاکٹر اشرف جو اسکا علاج کر رہا تھا یہ سارا منظر بڑے دھیان سے دیکھ رہا تھا۔ سولہ موت کا کلیجہ جب رو دھو کے کچھ ہلکا ہوا تو ڈاکٹر اشرف اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اُس سے استفسار کرنے لگا۔ ''سچ سچ بتاو کون ہو تم؟''

جواب میں سولہ موت بڑی بڑی آنکھیں کر کے اُسے ڈرانے لگا۔ ڈاکٹر اشرف ایسے لوگوں کے نفسیات سے کما حقہ واقف تھا اسلئے وہ بے پروائی سے بولا۔

''مجھے آنکھیں دکھا کر ڈرانے کی کوشش مت کرو۔ یہ مت بھولو کہ میں نے تین سال پاگلوں میں رہ کر گزارے ہیں۔ میں پاگل کو ایک نظر میں پہچان سکتا ہوں۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تم پاگل نہیں ہو۔ بس پاگل بننے کا ڈھونگ کر رہے ہو۔ کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟''

''یہ سچ ہے کہ میں پاگل نہیں ہوں۔ بس پاگل ہونے کا ڈھونگ کر رہا ہوں۔ دراصل میری

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بھی ایک بیٹی تھی جس کی عزت ایک درندے نے لوٹ لی اور پھر اُسے قتل کر دیا۔ مجھے لوگوں کے طعنے تشنیع سے بچنے کے لئے یہ فریب کرنا پڑا تبھی یہ بچی میری زندگی میں آ گئی۔ اسے پا کر میں اپنے سارے غم والم بھول گیا۔ آج جب یہ نئی دنیا بسا نیجا رہی تھی کہ اسے میری محبت واپس مجھ تک کھینچ لائی۔ ایک باپ یہ بات بھلا کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ اُس کی بیٹی شوہر کا گھر باپ کی خاطر چھوڑ دے اس لئے اس بندھن کو توڑنے کے لئے مجھے تھوڑی دیر کے لئے بے رحم بننا پڑا۔ آپ کو کیا لگ رہا ہے کہ اُسے تھپڑ مار کر میں چین سے بیٹھا ہوں۔ اُس کا روتا چہرہ دیکھ کر میری چھاتی پھٹی جا رہی ہے۔ ارے جس بچی کو آج تک میں نے ٹیڑھی آنکھ سے نہیں دیکھا اُسی بچی کو تھپڑ مارا۔'' کہہ کر وہ پھر سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر اشرف کچھ کہہ پاتا دفعتاً دروازہ کھلا اور بلی آ کر سولہ موت کے سامنے کھڑی ہو گئی اور رو رو کے کہنے لگی۔ ''بابا تم نے یہ کیسے کہہ دیا کہ میرا تمہارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ بابا کہو یہ سب جھوٹ ہے سب جھوٹ ہے۔ تم کبھی بھی مجھے اپنی زندگی سے الگ نہیں کر سکتے۔ ہے نا بابا؟''

سولہ موت ایکدم سکتے کے عالم میں تھا۔ بڑی مشکل سے وہ اپنے آپ کو سنبھال کر حزین اور پرسوز آواز میں اُس سے گویا ہوا۔

''میں جانتا ہوں کی یہ بندھن یوں ٹوٹنے والا نہیں ہے اور جب تک یہ بندھن ٹوٹے گا نہیں تم اپنا گھر بسا نہیں پاؤ گی۔ میں جانتا ہوں اس بندھن کو توڑنے کے لئے تم مجھسے بھاری قیمت چاہتی ہو۔ اگر تمہاری منشا یہی ہے تو یہی سہی میں بھی اپنے قول سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔'' کہکر وہ کھڑکی کی جانب بھاگا اور پھر چشم زدن میں وہ کھڑکی سے کود گیا۔ سامنے سے ایک ٹرک آ رہا تھا وہ اُسے کچل کر نکل گیا۔ اس سے پہلے کوئی کچھ سمجھ پاتا وہ اس جہان فانی سے بہت دور نکل چکا تھا۔ اُس کی مسخ شدہ لاش سڑک پر پڑی تھی اور بلی اُس لاش کے سامنے جامد و ساکت کھڑی تھی۔

■ ■ ■

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

فاصلے

حاکم دین کا ڈھوکا لائن آف کنٹرول سے چار ہاتھ کے فاصلے پر تھا۔ لائن آف کنٹرول وہ سرحد ہے جو کشمیر کو دو حصوں میں بانٹتی ہے۔ ایک حصہ اس طرف ہے جسمیں جموں اور لداخ بھی شامل ہے اور ایک حصہ اُس طرف ہے جو پاکستان کے زیر کنٹرول ہے۔ اُدھر والے اُس حصے کو آزاد کشمیر کہتے ہیں جب کہ ہم اُسے مقبوضہ کشمیر کے نام سے جانتے ہیں۔ حالات کی ستم ظریفی یہ ہے کہ اس ریاست کی طرح ہی دلوں کے بھی تیا پانچے ہو گئے ہیں۔ ایک ٹکڑا ادھر ہے تو ایک ٹکڑا اُدھر۔ سن سنتالیس کے قبائلی حملے کے بعد سینکڑوں خاندان دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک بھائی اُس طرف رہ گیا اور ایک بھائی اس طرف۔ بس رہ گیا یہ اوڑی کا پل جو ان دونوں حصوں کو ملاتا ہے۔ اس پل کا نام لال پل ہے جو برسوں سے کسی راہ گیر کی قدم بوسی کے لئے ترس رہا ہے۔ برسوں سے یہ پل دل میں نہ جانے کتنی حسرتیں لئے ویران اور اُداس آنکھوں سے کبھی اس طرف کے باسیوں کو تکتا ہے تو کبھی اُس طرف کے لوگوں کو نہارتا رہتا ہے۔ اس پل کی دیکھ ریکھ کرنے والا اگر کوئی ہے تو وہ ہے اس سے لگی ایک آرمی پوسٹ جسکا نام امن سیتو ہے۔

حاکم دین اُوڑی کی ان ہی پہاڑیوں پر رہتا تھا جہاں سے وہ اُس طرف کے لوگوں کی نقل و حرکت دیکھ تو سکتا تھا البتہ اُن سے مل نہیں سکتا تھا۔ بیچ میں جو ندی ایک لکیر کی شکل میں بہتی تھی اُس کا پانی دونوں اطراف کو میسر تھا مگر کنارے جدا جدا تھے۔ ایک کنارے پر پاکستانی رینجروں کا قبضہ تھا اور دوسرے کنارے پر ہندوستانی افواج کا۔ بیچ میں یہ جو ندی بہتی تھی وہ آزاد تھی۔ آج تک کوئی بھی ملک نہ اس کی روانی پر روک لگا پایا تھا اور نہ ہی اس کی سرکشی کو دبا پایا تھا۔ یہ شوریدہ سر ندی کبھی شانت رہتی تھی تو کبھی بے قابو ہو جاتی تھی۔ یہی حال پرندوں چرندوں کا تھا۔ وہ جب چاہتے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ادھر سے اُدھر چلے آتے تھے۔ کوئی اُنہیں روکنے ٹوکنے والا نہ تھا۔ اُن کے لئے نہ یہ سرحد کوئی معنی رکھتی تھی، نہ اس سرحد پر پہرہ دینے والے۔ آزاد پنچھی جو ٹھہرے۔ بس اگر ممانعت تھی تو وہ تھی انسانوں کو۔ شاید اسلئے کہ ہر فساد کی جڑ انسان ہی ہوتا ہے۔ چاہے وہ جس قوم کا ہو یا جس ملک کا۔ کیونکہ تعمیر کے ساتھ ساتھ تخریب بھی اُس کی سرشت میں شامل ہوتا ہے۔

حاکم دین اُوڑی کا باسی تھا۔ اُس کے پاس کئی بھینسیں تھیں جن کا دودھ مکھن بیچ کر وہ اپنا گزارہ چلاتا تھا۔ وہ صبح صبح دودھ بیچنے سلام آباد چلا جاتا تھا۔ وہاں سے اُلٹے پاؤں پھر کے آتا تھا اور پھر دودھ مکھن امن سیتو پر دینے چلا جاتا تھا۔ امن سیتو کی پوسٹ پر جتنے بھی فوجی طعینات تھے اُن کو حاکم دین کے دودھ مکھن کا ایسا چسکا لگ چکا تھا کہ وہ رات کی شراب قربان کر سکتے تھے مگر حاکم دین کے مکھن سے بنا پراٹھا لینا نہ بھولتے تھے۔ حاکم دین کا شدھ اور گاڑھا دودھ پی کر آدمی ماں کے تھن سے پیئے ہوئے دودھ کی لذت کو بھول جاتا تھا۔ اتنا بڑھیا اور لذیذ دودھ ہوا کرتا تھا حاکم دین کا۔ اُس کی صبح اور شام فوجیوں کے ساتھ ہی گزرتی تھی اسلئے وہ ان سے بڑا گھل مل گیا تھا۔ کبھی کبھی وہ اُسے خوش کرنے کے لئے اُسے گرم کپڑے اور کمبلیں اسٹاک سے نکال کر دے جاتے تھے۔ حاکم دین اُنہیں دعائیں دے کر چلا جاتا تھا۔

حاکم دین جب بھی امن سیتو پر دودھ دینے جایا کرتا تھا تو دودھ دے کر وہ لال پل کی منڈھیر پر جا کے بیٹھ جاتا تھا اور پھر گھنٹوں پل کے اُس اور دیکھنے لگتا تھا

جہاں اُس کا بڑا بھائی جمال دین جا کے بس گیا تھا۔ بھائی کی یاد آتے ہی اُس کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا تھا۔ کتنا چاہتا تھا وہ اپنے بڑے بھائی کو۔ افسوس کہ زراسی غلط فہمی میں برسوں کا پیار ایسی کڑواہٹ سے بھر گیا کہ جمال دین، حاکم دین کا نام لینے کا روادار نہ رہا۔ وہ اُسے اپنا چھوٹا بھائی نہیں بلکہ اپنا سب سے بڑا دشمن تصور کرنے لگا۔

ہوا یوں کہ سن نوے کی شورش سے پہلے گوجر اپنے ڈنگر لے کر سرحد کے اُس پار غلطی سے چلے جاتے تھے تو ادھر کے فوجی زیادہ باز پرس نہیں کیا کرتے تھے۔ بس دو چار طمانچے مار دئے اور جانے دیا۔ جمال دین بھی کبھی اپنے ڈھور ڈنگر لے کر پاکستان والے کشمیر میں چلا جاتا تھا۔ دن بھر اُس کے ڈنگر اُس علاقے میں چرتے رہتے تھے۔ شام ہوتے ہی وہ اپنے ڈنگر لے کر واپس چلا آتا تھا۔ کبھی حاکم دین یہ غلطی کر بیٹھتا تھا تو کبھی جمال دین۔ رات کو دونوں بھائی زیتون کا ہاتھ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بٹاتے تھے جو اکیلی بیس بھینسوں کا دودھ نکالتی تھی۔ زیتون جمال دین کی بیوی تھی۔ بڑی ہی خوبصورت اور وضع دار عورت تھی وہ۔ اُس کے آنے سے گھر کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ پہلے باندی خانے کی صفائی ہفتے میں ایک بار ہوا کرتی تھی لیکن جب سے زیتون اس گھر میں آ گئی تھی باندی خانے کی صفائی روز ہوا کرتی تھی۔ زیتون کے آنے سے ڈنگروں کا ہی بھلا نہیں ہوا تھا بلکہ جمال دین کے گھر میں بڑی برکت آ گئی تھی۔ پہلے چالیس کلو دودھ نکلتا تھا، اب ستر کلو دودھ بازار پہنچ جایا کرتا تھا۔ یہ سب کچھ زیتون کی اقبال مندیکے صدقے تھا۔ کہنے والے سچ ہی کہہ گئے ہیں کہ عورت کے ہاتھوں میں جادو ہوتا ہے۔ وہ پیتل کو ہاتھ لگا دے تو وہ سونا ہو جاتا ہے۔

اس بیچ اس پار کے کشمیر میں شورش نے سر اُٹھا لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے حالات بد سے بدتر ہونے لگے۔ جنگ تو نہیں چھڑ گئی تھی مگر حالات جنگ کے ماحول سے بھی بدتر تھے۔ سرحد پر چوکسی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ چوری چھپے سرحد پار کرنا پل صراط کو پار کرنے کے مترادف تھا۔ اب سرحد پر پرندہ بھی پر مارتا تھا تو فوجیوں کو ترت خبر لگ جاتی تھی۔ ایک دن جمال اپنے ڈنگر لے کے غلطی سے اُس پار چلا گیا۔ ڈنگر تو شام کو لوٹ آئے مگر جمال نہیں لوٹا۔ حاکم دین ادھر بھاگا، اُدھر بھاگا۔ فوجیوں کے سامنے فریاد کی۔ پولیس میں رپٹ درج کرائی مگر جمال کا کوئی پتہ نہ چلا۔ حاکم دین نے بھائی کی تلاش میں بستی کا چپہ چپہ کھنگالا مگر جمال کا کوئی سراغ نہ ملا۔ پولیس بھی حیران و پریشان تھی کہ آخر جمال کہاں چلا گیا۔ اُسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ ایک طرف حاکم دین بھائی کی اچانک گمشدگی کی وجہ سے پریشان تھا تو دوسری طرف زیتون نے رو رو کر اپنا برا حال کر دیا تھا۔ وہ ڈھنگ سے کھاتی تھی نہ سوتی تھی۔ بس جمال کو یاد کر کے آٹھ آٹھ آنسو بہایا کرتی تھی۔ حاکم اپنا غم بھول کر زیتون کو سنبھالنے میں لگا تھا۔ اُس کی دلجوئی کرنے میں ہی اسکا بیشتر وقت گزر جاتا تھا۔

ایک سال بیت گیا۔ جمال کے لوٹ آنے کی ساری اُمیدیں ایک ایک کر کے دم توڑنے لگیں۔ زیتون اپنے شوہر کی جدائی کے غم میں آدھی ہو چکی تھی۔ وہ بس آنے والوں کا منہ دیکھتی تھی اور جانے والوں کی پیٹھ۔ اس بیچ ایک دن مقدم دلنواز خان حاکم دین کا حال چال پوچھنے آیا۔ حاکم دین کسی حد تک بھائی کی جدائی کے غم کو بھول چکا تھا مگر زیتون سوکھ کر کانٹا ہو چکی تھی۔ زیتون کی حالت دیکھ کر مقدم کے دل کو برا گہرا دھکا لگا۔ وہ جہاں دیدہ آدمی تھا۔ بڑی دنیا دیکھی تھی اُس

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

نے۔ زیتون کی بھرپور جوانی ایک نظر میں اُس سے بہت کچھ کہہ گئی۔ اُسنے حاکم دین کو پاس بٹھایا اور پھر تحکمانہ انداز میں اُسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''یا تنے کے ہویا ہے۔ تنے کچھ دکھائی نہیں دیتو؟''

حاکم دین چودھری کی بات سن کر پہلے چونکا اور پھر جی کڑا کر کے اُسنے چودھری سے پوچھا۔

''منے سے کے بے ادبی ہوگئیو چودھری؟''

''بے ادبی نہیں۔ یہ پوچھ تنے سے کے گناہ ہوگئیو ہے۔ یہ توں کے حال کر چھڑیا ہے زیتون دا۔ کدی تونے سوچو اس کا کے بنے گو؟''

حاکم دین کا کلیجہ اُچھل کر حلق میں جا کے اٹک گیا۔ چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ وہ بدقت تمام بولا۔

''گل کے ہے۔ صاف صاف دسو نا چودھری؟''

''گل اے ہے کہ جمال نو لاپتو ہوئے ایک سال ہوگئیو ہے۔ منے تو پکو یقین ہے کہ جمال زندو نہیں مکی (مر) گئیو ہے۔ جدو وہ زندو ہوتو تو اتنو دن کدی دور نا رہتو۔ مارو دل کہندا ہے کہ وہ ہون کدی نہیں آوے گو۔ جمال کو آس امید میں بیسن (بیٹھے) رہن کی ہون کوئی لوڑ نہیں۔ توں جمال نو چھڑ کے جمال دی بوٹی کا کچھ خیال کر۔ کے حال بد ہوگئیو ہے بیچاری دا۔ رب دے واسطے یا تو سوچ یا اکیلو کے کرے گو؟ ماری صلاح مان۔ زیتون نو اپنو امان میں لو۔ رب تنے اس نیک کام دا اجر ضرور دیوں گو۔ زیتون کو بھلو بھی ہو جاوں گو اور تھارو ٹبر بھی بن جاوے گو۔''

بھائی کے موت کے خیال سے حاکم دین کے کلیجے پر چھریاں چلنے لگیں۔ آنکھوں سے آنسوں کی جھڑی لگ گئی۔ اُسے خود اس بات کا اعتراف تھا کہ اب جمال کی آس اُمید میں بیٹھے رہنا عبث تھا۔ وہ اگر زندہ ہوتا تو ایک سال تک روپوش نہ رہتا۔ کہیں کسی آفت افتاد میں پھنس بھی گیا ہوتا تو بھی کسی کے ہاتھ خیر خبر بھیجنے میں کوتاہی نہ برتتا۔ حالات تو مظہر تھے کہ جمال اب اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ اب اُس کی راہ دیکھنا فضول تھا۔ بستی کے لوگوں کا بھی یہی خیال تھا کہ اب جمال کے انتظار میں بیٹھے رہنے کا مطلب زیتون کے ساتھ سراسر ظلم اور ناانصافی کا مرتکب ہونا تھا۔ آخر وہ کب تک دہکتے انگاروں پر لوٹتی رہے گی۔ کب تک وہ اپنی جوانی کو اکیلے پن کی صلیب پر لٹکائے رکھے گی۔؟ کب تک وہ اپنے سلگتے ارمانوں کو تنہائیوں کا کفن پہناتی رہے گی؟ یہ وہ سوال

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

تھے جو چودھری کے من میں بار بار اُٹھتے تھے۔ چناچہ ان سارے سوالوں کا ایک ہی جواب تھا کہ حاکم دین زیتون سے نکاح کرلے۔ زیتون کو بھی سہارا مل جائے گا اور حاکم دین کا گھر بھی بس جائے گا۔

حاکم دین کو اس بجھاو میں کوئی کھوٹ خرابی نظر نہ آئی۔ گھر کی چیز گھر میں ہی رہ جائے گی تو گھر بھی صیح وسلامت رہے گا۔ پر وہ جلد بازی میں کوئی قدم اُٹھانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ یہ ایک زندگی کا سوال نہ تھا، بلکہ اس فیصلے کے ساتھ دو زندگیاں جڑی ہوئی تھیں اسلئے اُس نے چودھری سے دو دن کی مہلت مانگی۔ چودھری تو خوشی خوشی چلا گیا مگر حاکم دین عجب مخمصے اور تردد میں اُلجھ کر رہ گیا۔ وہ زیتون سے بات کرنا چاہتا تھا پر ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ اُس نے ایک دو بار کوشش کی پر کامیابی نہیں ملی۔

آخر تیسری بار اُس نے ہمت جٹا ہی لی۔ اُسنے زیتون کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنے پاس بٹھالیا اور پھر اُسے بڑے پیار سے سمجھاتے ہوئے بولا۔

"منے ایک گل دس۔ تنے کے لگدا ہے۔ جمال زندو ہے؟"

"زندو ہوتو تو منے یوں بھول نہ جاتو۔ کدی خیر خبر لین واسطے آ ہی جاتو۔"

حاکم دین نے اُسے سہارا دیتے ہوئے کہا۔

"چودھری یا ہی گل بات کرن واسطے آ گئیو تھو۔ آخر توں لوکاں کے طعنے کدتک جھلے (جھیلے) گو۔ کدی کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو رب سانو دوزخ میں جلائے گو۔ چودھری یہی گل بات دسن واسطے آئیو تھو۔ چودھری دا حکم ہے کہ ما تھارے نال نکاح کرلوں۔ تو دس تھاری کے مرضی؟"

زیتون نے پہلے چونک کر حاکم دین کی طرف دیکھا، پھر وہ شرما گئی۔ اُس کا شرمانا اس بات کا مظہر تھا کہ اُسے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ حاکم دین نے فوراً جا کر چودھری کو خبر کردی۔ چودھری بھی اس خبر سے باغ باغ ہو اُٹھا۔ اُس نے نے قاضی کو فوراً بلاوا بھیجا۔ قاضی چودھری کا حکم پاتے ہی دوڑا دوڑا چلا آیا اور پھر اُس نے دو بول پڑھ کے زیتون اور حاکم دین کو ازدواجی رشتے میں باندھ لیا۔

مرد کی قربت پا کر زیتون کی مرجھائی ہوئی زندگی میں پھر سے بہار آ گئی۔ اُس کی کھوئی ہوئی خوشی پھر سے اُس کے چہرے پر کھل اُٹھی۔ حاکم دین کی بے معنی اور بے رنگ زندگی کو ایک نئی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

رنگینی، ایک نیا مفہوم اور مقصد مل گیا۔ اب جب بھی وہ دودھ دینے باہر جاتا تھا تو زیادہ دیر تک باہر رہ نہیں پاتا تھا۔ باہر جاتے ہی اُسے زیتون کی یاد ستانے لگتی تھی۔ زیتون بھی اتنا بھرپور پیار پا کر پھولے نہیں سما رہی تھی۔ اس بیچ زیتون نے ایک گول مٹول سے بیٹے کو جنم دیا۔ حاکم دین کو لگا جیسے اُس کے دونوں جہاں روشن ہو گئے۔ وہ بیٹا پا کر خوشی سے نہال ہو اُٹھا۔ اُسنے اپنے بیٹے کا نام جمال رکھ دیا تا کہ اسی بہانے وہ اپنے بھائی کو یاد کرتا رہے۔

زندگی بڑے اطمینان اور چین سے گزر رہی تھی کہ اچانک ایک دن ایسا زلزلہ آ گیا جس نے حاکم دین اور زیتون کی زندگی ہلا کر رکھ دی۔ جمال مرا نہیں بلکہ زندہ تھا اور وہ غیر قانونی طور بوڑر کراس کرنے کے جرم میں دھر لیا گیا تھا اور وہ مظفرآباد کی ایک جیل میں دو سال تک قید رہا۔ رہا ہوا تو ایک سال تک وہ اسی تگ و دو میں لگا رہا کہ کسی نہ کسی طرح وہ سرحد پار کر کے اپنے عیال تک پہونچ سکے۔ آخر ایک دن وہ سرحد پار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

جب اُس نے اپنی بستی میں قدم رکھا تو اُس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے بلکہ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ہوا میں اُڑا جا رہا ہو۔ اپنے گھر والوں سے ملنے کی خوشی کا احساس ایک نشہ ایک سرور بن کر اُس پر طاری تھا۔ وہ دل میں ہزاروں خواب سجائے جب گھر میں داخل ہوا تو یہ روح فرسا خبر سن کر اُس کے پاؤں تلے کی زمین سرک گئی کہ زیتون نے حاکم دین سے نکاح کر ڈالا ہے۔ یہ خبر سن کر اُسے لگا جیسے اُس پر سات آسمان ایک ساتھ ٹوٹ پڑے ہیں۔ اُسے لگا کہ اُس کے بھائی نے اُس کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا ہو۔ اس صدمے نے اُسے اس قدر مجروح اور مشتعل کر دیا تھا کہ حاکم دین اور زیتون کی کوئی بھی دلیل، کوئی بھی صفائی اُسے جھوٹ اور مکاری لگی۔ چنانچہ وہ غصے سے اس قدر پاگل ہو اُٹھا کہ اُس نے کلہاڑی اُٹھا کر زیتون پر وار کرنے کی کوشش کی مگر پڑوسیوں کی بروقت مداخلت سے زیتون کی جان بچ گئی۔ حاکم دین قسمت کے اس بے رحم مذاق پر اپنا ماتھا پیٹ کر رہ گیا۔ جمال دین ہنگامہ کر کے چلا تو گیا البتہ جاتے جاتے یہ فہمائش کر کے گیا کہ وہ اس گھر میں تبھی قدم رکھے گا جب زیتون پھر سے اُس کی ہو جائے گی۔ وہ حاکم دین سے جاتے جاتے یہ کہکر گیا کہ وہ زیتون کو واپس حاصل کر کے رہے گا چاہے اُس کے لئے اُسے کسی کی جان کیوں نہ لینی پڑے۔

جمال سرحد پار چلا گیا پر جاتے جاتے وہ حاکم دین اور زیتون کو ایسا درد دے گیا جس کی کسک

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اُنہیں رات دن تڑپاتی رہتی تھی۔ یہ ایسا درد تھا جس کی دوا تھی نہ درمان۔ آخر قدرت اُن کے ساتھ یہ کیسا کھیل کھیل گیا تھا کہ وہ گنہگار نہ ہوتے ہوئے بھی گناہ گار ٹھہرائے گئے تھے۔ جمال اُنہیں ایسا شراپ دے کے چلا گیا تھا کہ اُنکی اچھی خاصی گھر گرہستی تحس نحس ہو کر رہ گئی۔ سب کچھ اُلٹ پلٹ ہو کے رہ گیا تھا۔ حاکم دین سب کچھ سہہ سکتا تھا مگر اپنے بھائی کی نفرت اور بدگمانی کو وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

ایک دن اُسنے اپنے سینے پر پتھر رکھ کر زیتون کو اپنی زندگی سے الگ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ فیصلہ لیتے وقت اُسے جس قدر تکلیف ہوئی وہ ناقابل بیان تھی۔

بہر حال اُس کے لئے ایسا فیصلہ لینا بہت ضروری تھا۔ اگر ایک پھوڑا بہت زیادہ تکلیف دے تو اُس پر نشتر چلانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ حاکم دین بھی اس پھوڑے کی پیڑا سے نجات پانا چاہتا تھا جس کا درد اب اُس کی برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ جمال کی کہی ہوئی باتیں اُسے بار بار کچوکے مارتی رہتی تھی۔ وہ پورے وجود سے تڑپ اُٹھتا تھا۔ ایک دن زیتون کو اُس کے ارادوں کی بھنک لگ گئی تو اُس کے ہوش اُڑ گئے اور وہ دوڑی دوڑی چودھری کے پاس چلی گئی اور اُسے رو رو کر اپنا دکھڑا سنایا۔ چودھری نے اُس کی ڈھارس بندھائی اور اُسے یقین دلایا کہ وہ حاکم دین کو ایسا کوئی قدم اُٹھانے کی ہرگز اجازت نہیں دے گا چاہے اس کے لئے اُسے سختی سے کیوں نہ کام لینا پڑے۔ چودھری کی اس یقین دہانی کے بعد زیتون کے کچھ آنسو پچھ گئے اور وہ خوشی خوشی گھر لوٹ آئی۔

اس سے پہلے کہ چودھری حاکم دین کو کوئی بھی قدم اُٹھانے سے باز رکھ پاتا اُسنے زیتون کو ایک دن غصے میں آ کر جھٹ سے طلاق دے ڈالی۔ زیتون کے وجود پر جیسے بجلی گری۔ آناً فاناً یہ خبر بستی میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ سبھی لوگ حاکم دین کے اس فیصلے سے سکتے میں رہ گئے۔ حاکم دین کے اس قدم سے سبھی کو دکھ اور افسوس ہو رہا تھا۔ حاکم دین کی اپنی دلیل تھی۔ وہ اپنے روٹھے ہوئے بھائی کے آگے زیتون کو چارہ بنا کر ڈالنا چاہتا تھا تاکہ وہ گھر لوٹ آئے اس کھیل میں دونوں بھائیوں کا کچھ نہیں بگڑ رہا تھا۔ اگر کسی کا کچھ بگڑ رہا تھا تو وہ زیتون تھی جس کی تو دنیا ہی لٹ رہی تھی۔ وہ تو ایک کھلونا بن کر رہ گئی تھی۔ چند دن بڑا بھائی اس کھلونے سے کھیلتا رہا اور پھر چند دن دوسرا بھائی۔ وہ تو دل بہلانے کا سامان بن کر رہ گئی تھی۔ اُس کا جیسے اپنا کوئی وجود تھا ہی نہیں۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

حاکم دین اپنے ارادے کا اٹل اور ضد کا پکا تھا۔ اُسنے یہ طے کرلیا کہ وہ زیتون کو لے کر سرحد کے اُس پار چلا جائے گا اور اسے جمال کو سونپ کر واپس چلا آئے گا۔ وہ زیتون کو اپنے بھائی کو سونپ کر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرلے گا۔ کوئی زیتون کے بارے میں سوچ ہی نہیں رہا تھا۔ کل کو اگر جمال کا اس کھلونے سے جی بھر گیا تو اُس کا کیا ہوگا۔ کیا وہ اسی طرح ایک ہاتھ سے نکل کر دوسرے ہاتھ میں جاتی رہے گی۔ کیا اس کی اپنی کوئی ہستی نہیں؟ حاکم نے طے کرلیا تھا کہ وہ بچے کا اپنے ساتھ رکھ لے گا۔ اُس کے جینے کے لئے اُس کے بچے کا سہارا کافی تھا۔ وہ باقی کی زندگی اسی کے سہارے کاٹنے کے لئے تیار تھا۔ زیتون حالانکہ ابھی تک اُسی کے گھر میں رہ رہی تھی مگر وہ اُس کے تئیں ایسی لاپرواہی اور بے رخی سے پیش آرہا تھا جیسے وہ اُسے جانتا تک نہ ہو۔ دونوں ایک ہی چھت کے نیچے رہ کے بھی ایک دوسرے سے کتنے دور چلے گئے تھے جیسے دو اجنبی ایک جگہ آکے رکے ہوں۔ جمال کے نازل ہونے سے اُنکی زندگی کا ڈھرہ ہی بدل چکا تھا۔ ایک طوفان ،ایک تلاطم، اُنکی خاموش زندگی میں اُٹھا تھا جس نے سب کچھ تلپٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ اس طوفان میں اپنا سب کچھ گنوا بیٹھے تھے۔

اسی دوران سیاسی فضا میں اچانک ایک طوفانی بدلاو آنے لگا۔ اُوڑی کا لال پل جو برسوں سے اُداس اور ویران پڑا ہاتھا، اُس پر نیا رنگ وروغن چڑھنے لگا۔

کاروانِ امن کے نام سے ایک بس شروع ہوگئی جو بچھڑوں کو ملانے کا کام کرنے لگی۔ حاکم دین بھی اُس پار جانے کے کاغذات حاصل کرنے میں جٹ گیا۔ زیتون رو رو کر ایک ایک کو اپنا دکھڑا سناتی جارہی تھی کہ آخر اُسے کس جرم کی پاداش میں اپنے لخت جگر سے الگ کیا جارہا ہے۔ کسی کے پاس اُس کے درد کا مداوا نہ تھا۔ تھک ہار کے وہ ایک دن چودھری کے گھر پر چلی گئی۔ اُس کے آگے اپنا بچہ رکھ کر وہ روتے ہوئے بولی۔

"تم ات چین سے بسیو (بیٹھے) ہے اور اُت ماری دنیا ویرانو ہوگئیو۔ کے گناہ ہے مارو۔ یا توں تھو جس دی صلاح من کے ای نکاح ہوگئیو۔ اب جمال سے ڈر کے حاکم منے طلاق دے گئیو اب تو دس مارو کا رکت ہے؟ مارو کا رآلو کون ہے؟ مینوں دس کہ مارے پوت کا کے بنے گو کے ما اس دے دو ٹکڑے کر کے جاوں یا اسے مار چھڑوں"

چودھری منہ میں گھنگھیاں بھر کر بیٹھا رہا۔ پہلی بار اُسے لگا کہ اُس کے پاس زیتون کے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے۔ پہلی بار اُسنے اپنے آپ کو بڑا بے بس اور لاچار پایا۔ کبھی کبھی حالات ایسا رخ اختیار کر لیتے ہیں کہ منصف خود سوالی بن کر کھڑا ہو یا تا ہے۔ یہی حال اسوقت چودھری دلنواز خان کا تھا۔ وہ زیتون کے روبرو سر نہوڑے بیٹھا تھا جیسے وہ منصف نہیں بلکہ خود مجرم ہو اور انصاف کے کٹہرے میں کھڑا اپنا فیصلہ سننے کا انتظار کر رہا ہو۔

وہ گھڑی قریب آ ہی گئی جب زیتون کو حاکم دین کے ساتھ اُس پار جانا تھا اور اپنے روٹھے ہوئے شوہر کو منا کر لانا تھا۔ وہ اپنے لخت جگر کو اپنے آپ سے الگ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ الگ کہاں تھا۔ وہ تو اُس کے وجود کا ایک حصہ تھا جس کے بنا وہ جی نہیں سکتی تھی۔ ایک شام وہ ننگے پاؤں اور ننگے سر گھر سے نکلی اور پوری رات کھلے آسمان کے نیچے بیٹھ کر وہ اپنے مالک سے یہ پوچھتی رہی کہ آخر اُسے کس خطا کی یہ سزا مل رہی ہے۔ وہ فریاد بھی کرتی رہی اور ساتھ ہی آنکھوں سے اشکوں کے دریا بہاتی رہی۔ بے کس اور لاچار کے پاس تو بس مولا کا ہی سہارا ہوتا ہے۔ اُسنے بھی مولا کا ہی دامن تھام لیا تھا۔

جمال کے پاس جانے کی گھڑی جتنی قریب آ رہی تھی زیتون کے دل کی دھڑکنیں اُتنی تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔ وہ اپنے بچے کو سینے سے لگاتی اور پھر وہ پھپھک کے روتی۔ اچانک اُس رات ایسا ہولناک بھونچال آ گیا جس نے دھرتی کو ہلا کر رکھ دیا۔ گوجروں کے ڈھوکے تاش کے پتوں کی طرح بکھر کر رہ گئے۔ اس پار تو زلزلہ اتنا شدید نہ تھا مگر اُس پار تو قہر مچ گیا تھا۔ اس آفات سماوی نے ایک جھٹکے میں ہزاروں جانیں نگل ڈالیں تھیں۔ زلزلے نے ایسی بھاری تباہی مچائی تھی کہ لاکھوں گھر ریت کے گھروندوں کی طرح مسمار ہو کر رہ گئے تھے۔ پاکستان کے زیر کنٹرول کشمیر کے پہاڑی علاقوں میں بہت کم لوگ بچے تھے۔

ایک دن خبر آئی کہ جمال دین کو بھی اس زلزلے نے نگل ڈالا تھا۔ حاکم دین تو اپنا سر پیٹنے لگا مگر زیتون بت بنی کھڑی رہی۔ اُسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس خبر پر روئے یا خوشی منائے کیونکہ وہ ایک بار پھر ایک عجب دوراہے پر آ کے کھڑی ہو گئی تھی۔

■ ■ ■

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

مرغی چور

آئے دن کسی نہ کسی بات کو لے کر ان میں تو بہ تکرار چلتی ہی رہتی تھی۔ صبح صبح اُن دونوں کے میاں گھر سے دفتر کے لئے کیا نکلے کہ دونوں بہوئیں اپنی اپنی آستین چڑھاتے ہوئے باہر آتیں اور پھر ایک دوسرے پر غراتے ہوئے کہتیں آ و پڑوسن لڑیں۔ ان دونوں کا یہ جھگڑا ٹنٹا گاوں والوں کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی بلکہ یہ تو روز روز کا قصہ تھا۔ پتہ نہیں کانتا اور فردوسہ کے بیچ کس بات کا بیر تھا کہ وہ ایک دن بھی لڑے بنا رہ نہیں سکتی تھیں۔ اصل میں جب سے ان دونوں کے شوہر ترقیاں پا گئے تھے سر میں کچھ زیادہ ہی خناس سما گیا تھا۔ شام کو جب ان کے میاں گھر میں پاؤں پوری طرح رکھ بھی نہیں پاتے تھے کہ دونوں کی بیویاں اپنی اپنی شکوہ شکایتوں کے دفتر کھول کر بیٹھ جاتیں تھیں اور کرنے لگتی تھیں ایک دوسرے کی غیبت۔ ان کے میاں بھی اُن کی اس روز روز کی جھک جھک سے عاجز آ چکے تھے پر اپنی بیویوں کا دل رکھنے کے لئے وہ اُن کی تک میں تک ملانے پر مجبور تھے اور اس طرح رات کا قضیہ وہ اگلے دن کے لئے اُٹھا کر رکھتے تھے۔ لیکن اُس دن تو حد ہی ہو گئی جب مشتاق کی بیوی فردوسہ نے پہلی بار کانتا کے بیٹے بٹو پر ہاتھ اُٹھا لیا۔ پیارے لال جو ہمیشہ لڑائی جھگڑے سے دور دور ہی بھاگتا تھا پر اُس دن وہ چاہ کر بھی پتا مار کر نہ بیٹھ سکا۔ بیٹے کے گال پر اُنگلیوں کے نشان دیکھ کر اُس کی مونچھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ رہ رہ کے اُس کا خون کھول رہا تھا اور وہ فردوسہ کی سات پشتوں کو تبرہ سنا کر باہر آ گیا اور باہر آ کر وہ فردوسہ کو للکارنے لگا۔ فردوسہ نے کھڑکی سے جھانک کر جب پیارے لال کو غصے سے یوں تمتمائے دیکھا تو وہ دبک کر وہیں بیٹھ گئی اور اپنے میاں مشتاق کو گرم کر کے محاذ پر روانہ کر دیا۔ مشتاق فوراً اپنی بیوی کی حمایت میں باہر نکل آیا۔ باہر پیارے لال غصے سے آڑھا ترچھا ہوا جا رہا تھا۔ پیارے لال کو

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

دیکھتے ہی مشتاق ہتھے سے اُکھڑ گیا اور پھر اُسے بے بھاو کی سنانے لگا۔ پیارے لال مشتاق کے اس برتاو سے پہلے تو بھونچکا رہ گیا پر سنبھلتے ہی وہ بھی مشتاق کو ترکی بہ ترکی جواب دینے لگا۔ اس سے پہلے کہ معاملہ قابو سے باہر ہو جائے کانتا نے پہلی بار سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کر کے پیارے لال کو اندر کھینچ لیا اور اسطرح یہ لڑائی ٹل گئی۔

مشتاق احمد اور پیارے لال کشمیر کے ایک دور افتادہ گاوں ماگام میں ایک دوسرے کے اڑوس پڑوس میں رہتے تھے۔ یہ گاؤں گل مرگ کے دامن میں واقع ہے۔ دور سے دیکھنے پر ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بچہ ماں کے قدموں میں بیٹھا کلکاریاں مار رہا ہو۔ اخروٹ کے پیڑوں سے گھرا یہ گاوں بھائی چارے کی ایک مثال تھا۔ اس گاوں میں آٹھ دس کشمیری ہندوں کے گھر تھے جب کہ اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ دونوں فرقے آپس میں صدیوں سے شیر و شکر بن کر رہ رہے تھے۔ چھوٹے موٹے جھگڑے ٹنٹے تو ہوتے ہی رہتے تھے جو کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ جہاں چار برتن ہوتے ہیں وہ کھنکتے ہی ہیں۔ تکرار کہاں نہیں ہوتی ہے۔ گھر میں ساس بہو کی تکرار۔ دفتر میں بڑے بابو اور چھوٹے بابو کے بیچ تکرار۔ بس میں کنڈکٹر اور ڈرائیور کے بیچ تکرار۔ پڑوسی اس علت سے کیسے بچ پاتے۔ مشتاق اور پیارے لال ایک ساتھ پلے بڑھے تھے۔ ایک ساتھ کھیل کود کر جوان ہوئے۔ شادیاں کیا ہوئیں کہ دونوں دوست ایک دوسرے سے دست و گریبان ہونے لگے۔ اصل میں ان دونوں کی بیویاں بڑی ہی مغرور اور جھگڑالو قسم کی عورتیں تھیں۔ ایک سیر ہے تو دوسری سوا سیر۔ لڑنے بھڑنے میں اُنہیں بڑا مزہ آتا تھا۔ جس دن وہ لڑتی نہیں تھیں ایسا لگتا تھا جیسے وہ بیمار ہو گئی ہوں یا ہتھیار ڈال کر بیٹھ گئی ہوں۔ پاس پڑوسی اسطرح کا سکوت دیکھ کر چونک جاتے اور پھر اس بات کی ٹوہ لیتے کہ کہیں دو میں سے ایک کی طبعیت بگڑ نہ گئی ہو۔

مشتاق محکمہ ٹرانسپورٹ میں ملازم تھا جب کہ پیارے لال سری نگر کے ایک سرکاری اسپتال میں کمپونڈر تھا۔ گاوں میں کمپونڈر کی بڑی عزت ہوتی ہے۔ گاوں والوں کے لئے وہ کسی مسیحا سے کم نہیں ہوتا ہے۔ پیارے لال کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ اُس کے ہاتھ میں شفا ہے۔ وہ جس مریض کو ہاتھ لگاتا تھا اُس کا آدھا دکھ درد اُس کا ہاتھ لگتے ہی دور ہو جاتا تھا۔ صبح شام پیارے لال کے گھر پر مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ پیارے لال کے لئے مریض کی اہمیت کسی فرشتے سے کم نہیں ہوتی تھی۔ وہ چاہے تھکا ماندہ ہو یا بھوکا پیاسا، ایک بار مریض اُس کے آگے کھڑا ہوا تو وہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کھانا پینا بھول کر مریض کی دیکھ ریکھ میں جٹ جاتا تھا۔ وہ بڑا خوش خلق اور حلیم تھا۔ کبھی اُس کی جبین پر کسی نے بل پڑتے نہیں دیکھا۔ وہ اپنے پاس پڑوسیوں کا علاج معالجہ مفت میں کرتا تھا۔ اتنا ہی نہیں۔ وہ دوائیاں بھی ادھر اُدھر سے مانگ تانگ کر ان کے گھر پر پہونچا دیا کرتا تھا۔ اتنا پیار کرتا تھا وہ اپنے گاوں کے لوگوں سے۔ وہ بھی اُس پر جان چھڑک دیتے تھے۔

مشتاق اور پیارے لال صبح صبح ایک ساتھ گھر سے دفتر کے لئے نکلتے تھے۔ مشتاق اُسے اپنے ساتھ سرکاری بس میں بٹھا دیتا تھا۔ اُس کے ہوتے ہوئے کیا مجال کہ کنڈکٹر اُس سے کرایہ مانگنے کی جرات کر سکے۔ وہ کبھی اکیلے بھی اگر سرکاری بس میں سفر کرتا تھا تو مشتاق کا حوالہ دیکر مفت کی سواری کر لیا کرتا تھا۔ جب سیاں بھیے کتوال تو ڈر کاہے کا۔ مشتاق تو ٹرانسپورٹ کے اسی محکمے میں ریکارڈ کیپر تھا اسلئے بسوں کے سبھی کنڈکٹر اُس سے یہ سوچ کر رشتہ بنا کر رکھتے تھے کہ کہیں کسی دن اس سے کام پڑ گیا تو کام نکالنے میں آسانی ہوگی۔ بدلے میں پیارے لال مشتاق کے گھر میں مفت کی دوائیاں بھیجا کرتا تھا۔ ان دونوں کے بیچ پیار و محبت کا ایک انوکھا بندھن تھا۔ اس بندھن میں حلاوت ہی تھی اور کڑواہٹ بھی۔ محبت بھی تھی اور نفرت بھی۔ اختلاط بھی اور اختلاف بھی۔

یہ گاوں کی زندگی بھی آسان نہیں ہوتی۔ یہاں تو ہر پل تلوار کی دھار پر چلنا پڑتا ہے۔ گاوں میں رہنے والوں کی زندگی ڈھور ڈنگر کے بنا ادھوری ہے۔ زیادہ نہیں تو کم سے کم ایک دو گائیں گھر میں دودھ کے لئے پال کے تو رکھنی ہی پڑتی ہیں۔ بچے کمزور نہ رہیں اسلئے آٹھ دس مرغیاں رکھنا بھی بیحد ضروری ہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ سارے فساد کی جڑ تو یہی جانور ہیں پھر بھی لوگ انہیں شوق سے پالتے رہتے ہیں۔ گاوں میں جتنے بھی جھگڑے ٹنٹے ہوتے رہتے ہیں بیشتر جھگڑوں کے سبب یہی جانور ہوتے ہیں۔ کسی کے کھیت میں کسی کی گائے گھس گئی تو رلا پڑ گیا۔ کسی کی مرغی یا مرغے نے کسی کی سبزی کا کھیت اُجاڑ دیا تو ہنگامہ ہو گیا۔ جانور تو کود پھاند کے نکل جاتے ہیں بھگتنا پڑتا ہے انکے مالکوں کو۔ پیارے لال نے بھی کئی مرغیاں اور گائیں پال رکھی تھیں جو ان دونوں گھرانوں کے بیچ باعث فتنہ بنی رہتی تھیں۔ پیارے لال کی ایک مرغی مشتاق کے ایک مرغے پر لٹو ہو گئی تھی۔ صبح صبح دڑبے سے نکل کر وہ پہلے دانہ دنکا چن لیتی تھی اور پھر یہاں سے وہاں پھر ہو جاتی تھی۔ کانتا دڑبے دڑبے چلاتی رہتی تھی پر وہ کہاں سننے والی۔ وہ کم بخت تو مشتاق کے مرغے کی چونچ سے چونچ لڑانے میں مشغول رہتی تھی۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کانتا مرغیوں کا بڑا خیال رکھتی تھی۔ اُسے دیسی مرغیاں بیحد پسند تھیں۔ ان کے انڈے وہ بچوں کو سویرے سویرے کھلایا کرتی تھی۔ دو بچے تھے۔ دونوں کے دونوں ایکدم سوکھے ست اور لاغر۔ کانتا اُنہیں گھر کا گھی مکھن کھلا کھلا کر تھک چکی تھی پر دونوں مریل کے مریل ہی رہے۔ کسی نے صلاح دی کہ دودھ مکھن سے بہتر ہے کہ انہیں دیسی انڈے نہار منھ کھلا دئے جائیں تو یہ سوکھا سا بدن فوراً بھر جائے گا۔ کانتا کب سے اس لال رنگ کی مرغی کے پیچھے پڑی تھی کہ یہ انڈے دے تو وہ اپنے بچوں کو گھر کے انڈے کھلا سکے۔ کانتا انڈوں کے انتظار میں دن دن گنتی رہی پر وہ کمبخت ایک انڈے کی جھلک نہ دکھا پائی۔ حد تو تب ہوگئی جب وہ ایک دن کڑک ہوکر بچوں کو کاٹنے دوڑی۔ کانتا تو پہلے بھونچکی ہوکر رہ گئی۔ وہ تو انڈوں کے آس میں بیٹھی تھی۔ یہ تو کم بخت سارے انڈے کہیں دے کے آگئی تھی۔ کانتا کو بڑا غصہ آیا اس حرام خور مرغی پر جو کہ دانہ دنکا اس گھر کا چگتی تھی اور انڈے کہیں اور دے کے آئی تھی۔ کانتا نے جب یہ بات پیارے لال کے کان میں ڈالی تو وہ بھی اس مرغی پر برہم ہو اُٹھا۔ اُس نے اگلے روز سے مرغی کی ٹوہ لینی شروع کی۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آخر یہ مرغی دن بھر رہتی کہاں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جہاں دن بھر رہتی ہوگی وہیں پر انڈے بھی دئے ہونگے اسنے۔ پتہ چلا کہ وہ انڈے مشتاق کے گھر پر دیکر آتی تھی۔ پیارے لال کا خون کھول اُٹھا۔ رات کو جب مشتاق گھر لوٹا تو پیارے لال نے اُس پر چوری اور بددیانتی کا الزام لگا لیا۔ مشتاق تو پہلے سے ہی بھرا ہوا بیٹھا تھا۔ پیارے لال کی باتوں سے وہ چراغ پا ہو اُٹھا۔ وہ سیدھے تھکا فضیحتی پر اُتر آیا۔ اُس نے آو دیکھا نہ تاو، بیوی بچوں کے سامنے پیارے لال کو دو چار موٹی موٹی گالیاں دیں۔ پیارے لال مشتاق کے اس برتاو سے دم بخود ہو کر رہ گیا۔ اُس کے جی میں آیا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اسی میں سما جائے۔ بیوی بچوں کے سامنے مشتاق نے اُس کی عزت کی ایسی تیسی کر کے رکھ دی تھی۔ وہ بھی اپنے غصے کو دبا نہ سکا اور اُسنے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اس سے پہلے کہ نوبت مار پیٹ تک نہ پہونچ جائے کئی پڑوسی بیچ بچاو کرنے چلے میں آئے اور دونوں کو سمجھا بجھا کر اپنے اپنے گھر میں بھیج دیا۔

اس واقعے کے بعد دونوں ایک دوسرے سے بات کرنا تو دور منھ دیکھنے کے بھی روادار نہ رہے۔ صبح صبح دونوں ایک ہی وقت آفس سے گھر کے لئے نکلتے تھے۔ دونوں ریل کی پٹری کی طرح ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بھی ایک دوسرے کی طرف نہ ہی آنکھ اٹھا کر دیکھتے تھے اور نہ ہی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بات کرتے تھے۔ بس اڈے پر پہونچ کر وہ ایک بس میں سوار نہ ہو کے الگ الگ بسوں میں سوار ہوتے تھے۔ عورتیں نے بھی آپس میں بول چال بند کر دی تھی۔

ایک رات مشتاق کا بیٹا اچانک بیمار پڑ گیا۔ اُس کے پیٹ یں شدید درد اُٹھا اور وہ درد کی شدت سے چیخیں مارنے لگا۔ مشتاق کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ بچے کو لے کر کہاں جائے۔ اس گاوں میں جو کچھ بھی تھا پیارے لال ہی تھا۔ وہ اُس کے پاس آخر کس منھ سے جاتا۔ جاتا بھی تو کیا وہ اُس کے بچے کا علاج کرے گا۔ پیارے لال گھر میں بیٹھا تھا کہ اچانک مشتاق کے بیٹے کی چیخیں اُسے سنائی دیں۔ وہ اپنے آپ کو روک نہ سکا۔ سرعت سے کھڑکی کے پاس آکر دھیان سے بچے کی چیخیں سننے لگا تا کہ وہ یہ اندازہ لگا سکے کہ آخر بچہ اس طرح کیوں رو رہا ہے۔ اچانک فردوسہ کی آواز گونجی جو اصل میں سنانا چاہتی تھی پیارے لال کو پر مخاطب ہوئی مشتاق سے۔

''میں نے کہا دیکھ کیا رہے ہو۔ بچے کے پیٹ میں شدید درد ہے۔ اسے فوراً کسی ڈاکٹر کے پاس لے جاو۔''

پیارے لال یہ آواز سنتے ہی معاً اٹھا اور پھر نیچے والے کمرے میں چھپ چھپا کے چلا گیا مبادا کانتا کو پتہ نہ چلے اور اپنی دوائی کے ڈبے میں سے چار گولیاں نکال کر بغل والے کمرے کے دروازے کی اوٹ میں کھڑا ہوا اور پھر اپنے بڑے بیٹے بٹو کو ہاتھ کے اشارے سے باہر بلایا اور اُسے سرگوشیوں میں سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ دوائی لے کر فردوسہ آنٹی کے یہاں ابھی جاو اور اُسے یہ گولیاں دیکر کہنا کہ وہ عارف کو گرم دودھ کے ساتھ دو گولیاں ابھی اور دو صبح کو کھلا دے۔''

بٹو گولیاں لے کر فردوسہ کے یہاں چلا گیا۔ فردوسہ جیسے اسی انتظار میں بیٹھی تھی۔ اُس نے فوراً گولیاں بٹو کے ہاتھ سے لپک لیں او پھر دو گولیاں عارف کے منہ میں ٹھونس دیں۔ مشتاق پاس ہی بیٹھا تھا۔ وہ شرم سے سر جھکائے بیٹھا رہا۔ منھ سے ایک لفظ نہیں بولا۔ بٹو دوائی دیکر وہاں سے چلا آیا۔ گولیاں کھاتے ہی عارف کو دھیرے دھیرے آرام آنے لگا۔ فردوسہ اور مشتاق نے راحت کی سانس لی اور دل ہی دل میں پیارے لال کو دعائیں دینے لگے۔

زندگی بس یوں ہی رواں دواں تھی کہ دفعتاً ایک طوفان آگیا۔ وادی کے حالات اچانک بگڑنے لگے۔ اقلیتی طبقے میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ یہ لوگ ہمیشہ بھاگتے کے آگے اور دوڑتے کے پیچھے رہے ہیں۔ جس دن یہ خبر آئی کہ سری نگر کے ایک جانے مانے کشمیری ہندو وکیل کو کسی نا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

معلوم شخص نے گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے تو پورے اقلیتی طبقے میں کھلبلی مچ گئی۔ کسی نے اُداسا کسنا شروع کیا۔ کوئی رات کے اندھیرے میں نقل مکانی کر گیا۔ کوئی چوری چھپے اپنے بال بچوں کو لے کر گھر سے بھاگ گیا۔ مطلب یہ کہ جس کے جدھر سینگ سما لئے وہ اُدھر کو ہو لیا۔ اب سچائی سے کہیں زیادہ افواہوں کا بازار گرم تھا۔ لوگ ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا کر رکھ دیتے تھے۔ دور دراز کے گاوں میں رہنے والے کشمیری پنڈتوں کی حالت تو دگرگوں تھی۔ اُنکے سروں پر تو خوف کی تلوار ہر دم لٹک رہی تھی۔ وہ آٹھوں پہر اپنے آپ کو موت کے سایے تلے بیٹھے محسوس کر رہے تھے۔

ایک دن مشتاق کی ایک مرغی اچانک غائب ہوگئی۔ فردوسہ اور مشتاق نے مرغی کی تلاش میں گھر کا چپہ چپہ چھان مارا۔ مرغی کیا مرغی کی گرد تک نہ ملی۔ مشتاق حیران تھا کہ آخر مرغی اچانک غائب کہاں ہوگئی۔ وہ دو ایک دن اسی تگ و دو میں رہا کہ تیسرے روز اُسے پیارے لال کے گھر کے پچھواڑے میں مرغی کے بال و پر مل گئے۔ مشتاق کا خون کھول اُٹھا۔ وہ پروں کو سمیٹ کر پیارے لال کے صحن میں آکر زور زور سے چلانے لگا۔ مشتاق کے سر پر خون سوار تھا۔ خوش قسمتی سے اُس وقت پیارے لال گھر پر موجود نہیں تھا۔ وہ ہوتا تو بہت بڑا قہر ہو جاتا۔ اُسنے اپنا غصہ دو گھرانوں کے بیچ کھڑی دیوار پر اُتارا اور آخر میں پیارے لال کو تبرہ سنا کر چلا آیا۔

جب رات کو پیارے لال گھر لوٹا تو کانتا نے اس واقعے کو نمک مرچ لگا کر شوہر کے سامنے پیش کیا۔ پیارے لال تو پہلے سے بھرا ہوا بیٹھا تھا، یہ خبر سن کر وہ آگ بگولہ ہو اُٹھا۔ وہ معاً باہر آکر مشتاق کو للکارنے لگا۔ مشتاق تو پہلے سے ہی خار کھائے بیٹھا تھا۔ وہ پیچ و تاب کھا کر اُٹھا اور ہاتھ میں ایک ڈنڈا لے کر باہر آگیا۔ اس سے پہلے کہ گھر کا آنگن رزم گاہ میں تبدیل ہو جاتا، دو چار پڑوسی ادھر اُدھر سے بھاگ کر آگئے اور اُنہوں نے ان دونوں کو لڑنے بھڑنے سے روک لیا۔ مشتاق نے گھر میں گھستے گھستے پیارے لال کو یہ دھمکی دے ڈالی کہ اگر اُس نے ایک ہفتے میں یہ مکان خالی نہ کیا تو وہ اُسے جان سے مار ڈالے گا۔

پیارے لال اس دھمکی کو زیادہ اہمیت نہ دیتا اگر وادی کے حالات بگڑے نہ ہوتے۔ پیارے لال اور کانتا نے اس دھمکی کو جب حالات کے تناظر میں دیکھا تو اُنہیں اپنی جان خطرے میں پڑی دکھائی دی۔ پیارے لال اپنے بال بچوں کی زندگی جوکھم میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ مشتاق کا اُٹھنا بیٹھنا ہر طرح کے لوگوں سے تھا۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اُس نے یہ دھمکی اُسی بوتے پر تو دی تھی اسلئے کانتا اور پیارے لال نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ چند روز کے لئے جموں چلے جائیں۔ جب حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو وہ اپنے گھر لوٹ کر آئیں گے۔ وہ یہ بات اچھی طرح سے جانتے تھے کہ گاؤں والے اُنہیں کسی بھی قیمت پر یہ گاؤں چھوڑ کر جانے کی اجازت نہیں دیں گے اسلئے اُنہوں نے یہ طے کیا کہ وہ رات کی تاریکی میں گھر سے نکل جائیں گے۔ وادی کے بیشتر اقلیتی کنبے اسی طرح رات کی تاریکی میں گھر سے بھاگے تھے۔ کانتا نے پیارے لال کے اس فیصلے سے اتفاق کیا اور اگلے روز پیارے لال دوپہر ڈھلتے ہی سری نگر چلا گیا اور کانتا کو یہ فہمائش کر کے گیا کہ وہ چھوٹا موٹا سامان باندھ کے رکھے تاکہ وہ جب ٹمپو لے کر آجائے تو اُنہیں سامان لادنے اور ٹمپو میں بیٹھنے میں پانچ سات منٹ سے زیادہ وقت صرف نہیں ہونا چاہیے۔ اگر اس بیچ کہیں کوئی پاس پڑوسی جاگ گیا تو اُن کا بھاگنے کا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔

کانتا نے شام ڈھلنے سے پہلے ہی چھوٹا موٹا سامان اٹچیوں میں بھر کے رکھا تھا۔ اُس کا من بڑا بوجھل اور اُداس تھا۔ گھر چھوڑنے کے احساس سے کلیجہ منہ کو آرہا تھا۔ مرد سے کہیں زیادہ عورت جذباتی طور پر گھر سے منسلک ہوتی ہے۔ کانتا نے اس گھر کو اپنے ہاتھوں سے سجایا سنوارا تھا۔ اس گھر کے زرے زرے میں جیسے اُس کی آتما رچی بسی ہوئی تھی۔ وہ نمناک آنکھوں سے در و دیوار کو تکے جا رہی تھا جن سے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچھڑنے والی تھی۔ ایکطرف اُس کا دل غم سے ڈوبا جا رہا تھا تو دوسری طرف کسی کو گھر کی جانب آتے دیکھ کر اُس کا کلیجہ کانپ اُٹھتا تھا۔ وہ آدھی رات تک اسی تردد اور تذبذب میں پڑی رہی۔ اُس کی جان تب تک سولی پر اٹکی رہی جب تک پیارے لال ٹمپو لے کر نہ آگیا۔ اُنہوں نے ہبڑ دھبڑ میں چوروں کی طرح اپنا سامان ٹمپو میں لادا اور پھر نندا سا کی حالت میں بچوں کو ٹمپو میں دھکیل دیا۔ کانتا کا دل بری طرح ڈول رہا تھا۔ پاؤں جیسے من من بھر کے ہو گئے تھے۔ پیارے لال نے لپک کر اُسے ٹمپو کی اگلی سیٹ پہ بٹھا دیا۔ جب وہ خود پیچھے بیٹھنے کے لئے ٹمپو کی طرف بڑھا تو ٹمپو میں بیٹھنے سے قبل اُسنے اپنے گھر پر ایک الوداعی نگاہ ڈال دی۔ لاکھ کوشش کے باوجود وہ اپنے آنسو روک نہ سکا۔ اُس کی آنکھوں سے اشکوں کا ایک سیلاب اُمڈا اور جب تک اُنہوں نے جواہر ٹنل پار نہ کی وہ تب تک مسلسل روتا رہا۔ آگے بیٹھی کانتا بھی چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھی۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اگلے روز جب آفتاب طلوع ہوا تو مشتاق یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ پیارے لال کے گھر کے دروودار بند پڑے ہیں۔ اُس نے دزدیدہ نگاہوں سے گھر کی جانب دیکھا تو اُسے گھر کے اندر کوئی حرکت دکھائی نہ دی۔ اُس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ بھاگ کر فردوسہ کے پاس گیا جو کہ کچن میں کام کر رہی تھی۔ اُسنے گھبرائی ہوئی آواز میں فردوسہ سے پوچھا۔ ''پیارے لال کے گھر میں سناٹا کیوں چھایا ہوا ہے۔ خدا خیر کرے۔ کہیں کچھ گڑبڑ تو نہیں ہے۔''

فردوسہ نے چونک کر شوہر کی طرف دیکھا اور پھر وہ کھڑکی کی طرف بھاگی۔ اب کے اُس نے کھڑکی سے سر نکال کر پورے گھر کا جائزہ لیا۔ گھر میں تو واقعی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اب کے وہ بھی تردد میں پڑ گئی۔ اُس نے زور زور سے بٹو کا نام لے کر چلانا شروع کیا جب گھر کے اندر سے کوئی حرکت نہ ہوئی تو وہ دونوں سراسیمہ ہو کر نیچے بھاگے اور اگلے پچھلے گلے شکوے بھول کر وہ بے ساختہ پیارے لال کے گھر کی جانب دوڑے اور جا کے دروازے کے پاس رک کر کھڑے ہو گئے۔ یہ دیکھ کر وہ دونوں دھک سے رہ گئے کہ دروازے پر ایک وزنی قفل پڑا تھا۔ مشتاق تو دھم سے نیچے بیٹھ گیا جب کہ فردوسہ بت بنی بہت دیر تک یونہی کھڑی رہی۔

یہ خبر گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ پیارے لال گاؤں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ گاؤں میں تو جیسے ماتم چھا گیا۔ کچھ لوگ تو سچ مچ رونے لگے۔ کئی ایک تو مشتاق پر برہم ہو اُٹھے۔ اُنہوں نے مشتاق کو ہی پیارے لال کی نقل مکانی کا ذمہ دار ٹھہرایا کیونکہ اُسی نے پیارے کو ڈرایا دھمکایا تھا۔ مشتاق ایک مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔ وہ مارے شرم وندامت کے کسی سے آنکھیں نہیں ملا پا رہا تھا۔ غصے میں آدمی کیسی احمقانہ حرکتیں کرنے لگتا ہے اس کا اندازہ اُسے اب ہو رہا تھا۔

گاؤں والوں نے پیارے لال کی کہاں کہاں کھوج نہ کی مگر اُنہیں اُس کی گرد تک نہ ملی۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے چلا گیا تھا۔ بھرا پرا گھر، ڈھور ڈنگر۔ ایک مہینے بعد پتہ چلا کہ وہ جموں میں ہے۔ اسی بیچ ایک دن مشتاق کا ایک اور مرغا غائب ہو گیا۔ اگلے روز اُس کے بھی بال و پر اُسے پیارے کے گھر کے پچھواڑے میں ملے۔ اب کے مشتاق چونک پڑا۔ پیارے تو کئی مہینوں سے یہاں نہیں ہے تو پھر یہ حرکت کس نے کی ہے۔ مشتاق اب کے اصلی مجرم تک پہونچ جانا چاہتا تھا کیونکہ اُس کی اس مذموم حرکت سے دو گھرانوں کے بیچ بدگمانی اور ناچاقی اس حد تک بڑھ چکی تھی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کی ایک کنبہ یہ گاؤں چھوڑ کے ہی چلا گیا تھا۔ جلد ہی چور اُس کے ہتھے چڑھ گیا۔ ان وارداتوں کے پیچھے اسی گاؤں کے ایک اُود باش لونڈے غفار کا ہاتھ تھا۔ مشتاق کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ وہ غفار پر بھوکے بھیڑیے کی مانند پل پڑا اور مار مار کے اُسے ادھ موا کر کے چھوڑا۔ پاس پڑوسی شور سن کر جمع تو ہو گئے مگر کسی نے اُسے چار چوٹ کی مار سے بچانے کی کوشش نہ کی کیونکہ اُس کی اس حرکت نے اُنہیں شرمسار کر کے رکھ دیا تھا اُس دن کے بعد مشتاق اندر ہی اندر گھٹتا رہا۔ وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا پر اب تو بہت دیر ہو چکی تھا۔ پیارے لال تو اُسے ایسا شراپ دے کر چلا گیا تھا کہ زندگی اُس کے لئے ایک مسلسل عذاب بن کر رہ گئی تھی۔ وہ صبح نیند سے اُٹھتے ہی پیارے لال کے صحن میں جھاڑو لگا لیتا تھا اور پھر مرغیوں کو دڑبے سے آزاد کر دیتا تھا۔ دھیرے دھیرے حالات سدھرنے لگے۔ بجھے دلوں میں ایک اُمید کی کرن جاگی۔ لوگ ادھر اُدھر آنے جانے لگے۔ ایک دن محمد سلطان نامی ایک پڑوسی جموں میں پیارے لال سے ملا اور اُسنے جو خبر اُسے سنا ڈالی اُسے سن کر تو پیارے لال کے ہوش ہی اُڑ گئے۔ سلطان کے بیان کے مطابق مشتاق نے پیارے لال کے گھر پر قبضہ جما لیا تھا۔۔ ایک پڑوسی کی بے ایمانی کا قصہ سن کے پیارے لال کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ وہ مشتاق سے اس بد دیانتی کی قطعی اُمید نہیں رکھتا تھا۔ اب کے وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ اُسنے من میں ٹھان لی کہ کچھ بھی ہو وہ کل ہی سری نگر کے لئے روانہ ہو جائے گا اور پورے گاؤں کے سامنے مشتاق کی اصلیت کھول کے رکھ دے گا۔ کانتا بھی یہی چاہتی تھی کہ وہ جا کے دیکھے کہ مشتاق نے کس طرح اُن کی غیر موجودگی میں اُن کی جائیداد پر قبضہ جما لیا ہے۔

پیارے لال جب گاؤں میں وارد ہوا تو فرط مسرت سے لوگ ایسے اُچھل پڑے جیسے کوئی آسمانی فرشتہ زمین پر اُتر آیا ہو۔ لوگ فرط جذبات میں گھروں سے نکل کر آئے اور اُس سے لپٹ لپٹ کر رو پڑے۔ وہ بھی اپنے جذبات کو روک نہ پایا۔ یہ سب تو اُس کے اپنے تھے جن سے ملنے کے لئے وہ کب سے بن آب مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ چلتے چلتے ایک ہجوم جمع ہو گیا۔ وہ اس ہجوم کو لے کر اپنے گھر کی جانب چلا جا رہا تھا۔ دل میں ایک آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ اس بھرے ہجوم کے سامنے مشتاق کو ننگا کرنا چاہتا تھا۔ وہ جب چلتے چلتے اپنے گھر کی دہلیز تک پہونچ گیا تو یہ دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا کہ جو گائے اُس نے گاؤں چھوڑنے سے چند روز پہلے اسی گاؤں کے چوپان علی خان

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کو بیچی تھی وہ اُس کے صحن میں بندھی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا فردوسہ گھر سے دوڑتی ہوئی آئی اور آنکھوں میں آنسو لئے اُس نے پیارے لال سے پوچھا۔ ''آخر یہ کس گناہ کی سزا دے کر چلے گئے تم۔ خود تو جموں میں بیٹھ کر مزے کرتے رہے اور ہمیں یہاں رات دن اس گھر کی رکھوالی کرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ جا کے دیکھ جو کچھ تم چھوڑ کے گئے تھے وہ سب جوں کا توں پڑا ہے کہ نہیں اور ہاں تم نے جو گائے علی خان کو بیچی تھی وہ گائے تمہارے بھائی نیپسے دیکر واپس لے لی ہے۔ کہنے لگا کہ ایسے کیسے ہوسکتا ہے کہ ہمارے ہوتے ہوئے میرا بھائی اپنا مال بیچ کر جائے۔ کل کو جب کانتا بھابی اور بچے لوٹ کے آجائیں گے تو بنا دودھ کے وہ کیسے رہ پائیں گے'' پیارے لال جیسے زمین میں دھنس کے رہ گیا۔ اُسے لگا جیسے اُس پر گھڑوں پانی پڑا ہو۔ اُسنے نگاہ اُٹھا کے دیکھا۔ مشتاق آنگن کے باہر دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک سیلاب تھا جو باہر آنے کے لئے مچل رہا تھا۔ وہ اُس کی جانب بڑھا۔ دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے اور اُس کے بعد آنکھوں سے اشکوں کے سوتے اُبل پڑے۔

■ ■ ■

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

پمپوش

فردوسہ کی زندگی جھیل ڈل کی اُس شوریدہ سر موج سے کتنی مشابہت رکھتی تھی جسے ہوا کا ایک بے رحم تھپیڑا کنارے تک بہا کے لیجاتا ہے اور پھر یہ بے بس موج کنارے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہے اور آوارہ اور من موجی تھپیڑا نہال ہو کے کہیں اور نکل جاتا ہے۔ فردوسہ نے اپنی تمام تر زندگی اسی ڈل کے آغوش میں اسی جل ترنگ کی مانند گذاری تھی۔ اُس کا گھر ڈل کے بیچوں بنے ٹاپو پر واقع تھا۔ یہ ٹاپو چاروں اور پانی سے گھرا ہوا تھا۔ دور سے دیکھنے پر ایسا گمان گذرتا تھا جیسے نیلگوں پیمانے کے بیچوں بیچ زمرد کا نگ سجا کے رکھا گیا ہو۔ اس ٹاپو تک پہونچنے کے لئے کوئی زمینی راستہ نہ تھا۔ یہاں تک پہونچنے کے لئے آمد رفت کا واحد زریعہ پانی کی یہ ننگ دھڑنگ کشتیاں تھیں جن کے اوپر نہ کوئی چھت ہوتی تھی اور نہ بیٹھنے کے لئے کوئی روئی یا فوم کا گدا۔ یہ بے چین اور خستہ حال کشتیاں ہمیشہ گھاٹ سے لگی رہتی تھیں

فردوسہ کو اپنے چپو اور کشتی سے بے پناہ پیار تھا۔ اُس کی زندگی بڑے نشیب و فراز سے گزری تھی۔ صیح معنوں میں اُس کے دکھ سکھ کے ساتھی اُس کی ناو اور اُس کے چپو ہی رہے۔ جب بھی وہ اُداس تھی تو یہی کشتی اُسے اپنے سینے پر بٹھا کر اس ٹاپو سے کہیں دور لے جاتی تھی۔ جب بھی اُس پر کبھی کوئی افتاد پڑی تو اسی ناو نے اُسے اُس آفت سے نکالا۔ اُس نے اپنی عمر کی پچاس بہاریں اسی کشتی کے سہارے ڈل کے سینے پر چلتے پھرتے گذاری تھیں۔ بنا کسی یکسوئی کے۔ اُس کی زندگی کا ہر پل ایک طوفان بنکر گذرا۔ اس ڈل میں اُٹھتے تلاطم کی طرح۔ کب اُس کا بچپن نکل گیا کب جوانی نے دستک دی، کب وہ ایک الہڑ اور شوخ لڑکی سے ایک مکمل عورت بن گئی، اُسے پتا ہی نہیں چلا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ چار چار بچوں کی ماں بن گئی۔ آنکھوں کے حلقوں کے گرد جھائیاں اور چہرے پر جھریاں پڑنے لگیں تب بھی وہ اسی ڈل کی گود میں بیٹھ کر اٹکھیلیاں کرتی رہی۔ بچپن سے لے کے جوانی تک کے اُس کی زندگی کے سارے پل اس ڈل کے سینے پر رقم

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

تھے۔ وہ جب بھی اپنے شکارے پر بیٹھ کر ڈلگیٹ کے گھاٹ کی طرف بڑھتی تھی تو اُس کی آنکھوں میں خوشی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی تھی۔ بہت سارے مانوس چہرے دیکھ کر وہ کھل اُٹھتی تھی اور پھر وہ شکارے سے بہت سارے پمپوش اُٹھا کر لے آتی اور اُنہیں اپنے گراہکوں میں مسکراتے ہوئے تقسیم کرتی تھی جو صبح دم سے ہی اُس کے انتظار میں اس گھاٹ پر یوں آس لگائے بیٹھا کرتے تھے جیسے وہ کوئی دیوی ہو جس کی ایک جھلک پا کر اُنکے سارے پاپ دھل جائیں گے۔

فردوسہ برسوں سے کمل کے یہ پھول (جنہیں کشمیری میں پمپوش کہا جاتا ہے) بیچا کرتی تھی۔ یہی اُس کی آمدن کا زریعہ تھا۔ گل فروشی اُن کا خاندانی پیشہ تھا۔ اُس کے جد و اجداد بھی یہی کام کرتے تھے۔ اُس کے دادا نے اُسے پھول چننا سکھا دیا تھا۔ یہ پھول وہ بھور سے پہلے ہی ڈل کے پانیوں سے توڑ کر لاتی تھی اور پھر وہ یہ پھول اُن تک پہونچاتی تھی جن کو ان پھولوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ وہ ان پھولوں کی فضلیت کو سمجھتی تھی۔ ان کے تقدس کو پہچانتی تھی اسلئے وہ جب بھی گھر سے نکلتی تھی تو نہا دھو کر نکلتی تھی اور صاف و پاک ہو کے ہی وہ ان پھولوں کو ہاتھ لگاتی تھی۔ اُس کے گراہک بندھے ہوئے تھے۔ ایک گنپت یار کا مادھو جو تھا جو کہ بڑا ہی نیک اور پارسا آدمی تھا اور جو پچھلی کئی دہائیوں سے اُس سے یہ پھول خرید لیتا تھا۔ مادھو جو گنپت یار مندر کا پجاری تھا۔ برسوں سے وہ اس مندر میں یہ پھول چڑھاتا تھا۔ اُس کی زندگی اسی پوجا ارچنا میں گذر گئی تھی۔ وہ فردوسہ کو تب سے جانتا تھا جب وہ اپنے دادا نبر جو کا ہاتھ پکڑ کر چلتی تھی۔ نبر جو کے مرنے کے بعد اُسے مادھو جو میں اپنے مرحوم دادا کی شبہہ دکھائی دیتی تھی۔ اُس کے پہلو میں بیٹھ کر اُسے بڑی فرحت اور طمانیت محسوس ہونے لگتی تھی۔ اُسی کی زبانی بچپن میں اُسے یہ معلوم پڑا تھا کہ یہ کوئی عام پھول نہیں ہے بلکہ یہ بہت ہی مقدس اور متبرک پھول ہے۔ یہ پھول ہندو دیوی دیوتاؤں کو بے حد پسند ہیں جن میں شیو اور پاروتی کا نام اول تھا۔ وہ ہندو دھرم کے بارے میں زیادہ کچھ جانتی نہیں تھی ماسوائے اس کے کہ پاروتی اور لکشمی دو ایسی دیویاں ہیں جن کی ہندو پوجا کرتے ہیں۔ ایک بار مادھو جو اُس کے لئے ایک بڑی سی رنگین تصویر لے کے آیا جس میں لکشمی کو پمپوش کے پھولوں پر بیٹھے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ جب سے اُس کے دل میں ان پھولوں کے تئیں ایک احترام اور عقیدت کا جذبہ پیدا ہوا تھا۔ جب بھی وہ یہ پھول توڑتی تھی تو توڑنے کے بعد وہ والہانہ نگاہوں سے ان پھولوں کو چند لمحوں تک نہارتی تھی اور پھر ان پھولوں کو ٹوکری میں رکھتی تھی۔ ان پھولوں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کے ساتھ اُسے ایک جذباتی لگاؤ تھا۔ وہ ان پھولوں کی زبان سمجھتی تھی۔ اُنکے دکھ و درد کو محسوس کر سکتی تھی۔ اُنکو مسکراتے ہوئے دیکھ سکتی تھی۔

فردوسہ خود بھی اسی پہپوش کی طرح تھی۔ شدھ، صاف و پاک۔ مادھو جو جو کہ علم نجوم کا ماہر تھا۔ ایک بار اُس نے فردوسہ کا ہاتھ دیکھا۔ اُس کا ہاتھ دیکھنے کے بعد وہ بہت دیر تک اُداس ہو کے خلا میں گھورتا رہا۔ وہ جتنی دیر خاموش رہا فردوسہ کا دل حلق میں پھنسا رہا۔ وہ شاید کچھ بول بھی نہ پاتا مگر فردوسہ ایسے سر پڑ گئی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے فردوسہ سے یہ کہنا پڑا کہ اُس کی شادی شدہ زندگی پریشانی اور کٹھنائیوں سے بھری رہے گی۔ فردوسہ نے باہر سے کوئی ردِ عمل ظاہر نہ کیا البتہ وہ اندر سے دہل کے رہ گئی۔ اُن دنوں اُس کا دادا حیات تھا اور گھر کے سارے فیصلے اُسی کی رضا و رغبت سے لئے جاتے تھے۔ مادھو جو نے جب نبر جو کو جیوتش ودیا کے حوالے سے یہ بتانے کی کوشش کی کہ وہ فردوسہ کی شادی خوب دیکھ پرکھ کے ہی کرے ورنہ اُسے ساری زندگی پچھتانا پڑے گا تو نبر جو نے اُس کی اس پیش گوئی کو مذاق میں اُڑایا۔ مادھو جو نبر جو کا بہت پرانا دوست تھا۔ وہ کوئی بھی کام کرنے سے پہلے اُس سے رائے مشورہ ضرور لیتا تھا مگر فردوسہ کی ازدواجی زندگی کے بارے میں اُس کی پیشن گوئی کو اُس نے سنجیدگی سے لیا ہی نہیں۔ دراصل وہ توہمات کا کبھی بھی قائل نہ رہا تھا۔ وہ توکل والا آدمی تھا۔ وہ ہر کام خدا کے بھروسے پر کرتا تھا۔

نوردین ایک نوجوان ملاح تھا جو اُن ہی کی ذات برادری سے تعلق رکھتا تھا۔ دیکھنے میں وہ سوکھا مریل سا لگتا تھا۔ ایکدم مرزا پھویا مگر لڑنے بھڑنے میں اُس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ اُس کے اندر جیسے خون کی جگہہ بارود بھرا پڑا تھا جبھی تو وہ آگ دیکھ کے دہکنے لگتا تھا۔ وہ بڑا ہی اکھڑ، سڑیل اور چڑ قتا تیا تھا۔ نہرو پارک گھاٹ کا وہ بے تاج بادشاہ تھا۔ وہ صبح سویرے اپنی سجی دھجی کشتی لے کر گھاٹ پر پہنچ جایا کرتا تھا اور نمبر نہ ہوتے ہوئے بھی پہلی سواری لپک لیتا تھا۔ اب اگر نمبر والے نے احتجاج کے طور پر سواری روک لی تو نورا جامے سے باہر ہو جاتا تھا اور پھر وہ دوڑ کر اپنی ناؤ سے چپو اُٹھا کر لاتا تھا اور چپو کو پوری طاقت سے ہوا میں لہرا کر وہ سب کو چیلنج کرتا تھا۔ شکارے والے ڈر کے مارے ادھر اُدھر جا کر چھپ جاتے تھے۔ وہ کہتے ہیں ناحیا والا اپنی حیا سے ڈرا، بے حیا سمجھا مجھ سے ڈرا۔ نورا یہی سمجھتا رہا کہ وہ اُس سے خائف ہیں اسلئے وہ شیر ہو گیا تھا۔ اُس کے سنگی ساتھی رگڑے جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتے تھے اسلئے وہ ایسے غنڈے موالی سے دور رہنے میں ہی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اپنی عافیت سمجھتے تھے۔ اُس کے منہ لگنا بھڑ کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا۔ وہ کب کسے کاٹ پھاڑ ڈالے اس کے بارے میں کوئی پیش گوئی کرنا بے فضول تھا۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر اُبل پرتا تھا اور کسی کے ساتھ بھی دست وگریبان ہونے میں عار محسوس نہیں کرتا تھا۔ اُس کی اس غنڈہ گردی کی وجہ سے نہرو پارک گھاٹ کے سبھی شکارے والے دکھی اور پریشان تھے پر اس سے دودو ہاتھ کرنے کا کسی میں یارانہ تھا۔ پیٹھ پیچھے لوگ اُسے تبرہ بھیجتے تھے۔ منہ پر تو اُسی کی ٹک میں ٹک ملایا کرتے تھے۔ نورا کو اس غنڈہ گردی کا فائدہ یہ ہو رہا تھا کہ اُس کی کمائی دوسرے ملاحوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی ہوا کرتی تھی۔ ٹورسٹ سیزن میں تو وہ اچھی خاصی کمائی کرتا تھا پر وہ کہتے ہیں نا کہ کنوئیں کی مٹی کنوئیں کو ہی لگتی ہے۔ نورا بھی اپنی حرام کی کمائی دارو میں بہا دیتا تھا۔ اُسے شراب نوشی کی ایسی لت لگ چکی تھی کہ دارو کے بنا وہ ایک رات بھی گزار نہیں پاتا تھا۔ کام سے خلاصی پاتے ہی وہ اپنے سنگی ساتھیوں کے ساتھ لبہ کول کے بار میں پہونچ جایا کرتا تھا اور رات گئے تک وہ خم کے خم چڑھائے جاتے تھے۔

نورا فردوسہ کے پڑوس میں ہی رہتا تھا۔ وہ کہتے ہیں نا کہ سانپ سب جگہ ٹیڑھا چلتا ہے پر اپنی بانبی میں سیدھا جاتا ہے۔ وہ گھر میں ایسے رہتا تھا جیسے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔ وہ فردوسہ کو دل ہی دل میں پیار کرتا تھا پر نبر جو کے ڈر سے اظہار نہیں کر پاتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب تک وہ نبر جو کو اپنے حق میں ہموار نہیں کر پائیگا اُس کے پیار کا جذبہ اسی طرح سینے میں دبا رہے گا۔ اُسنے نبر جو کو شیشے میں اُتارنے کا فیصلہ کیا۔ جونہی نبر جو گھاٹ کی طرف نکل آتا تھا تو وہ دوڑ کر گھاٹ پر کھڑا ہو جاتا تھا اور پھر وہ ہاتھ باندھے تب تک کھڑا رہتا جب تک نبر جو ناؤ سے اُترتا نہیں تھا۔ اُترتے ہی اور وہ اُس کا ہاتھ تھام کر اُسے گھاٹ پر لے آتا تھا اور پھر چنار کے چھتنار سائے میں اُسے بٹھا کر وہ دوڑ کر حقہ لے آتا تھا۔ اپنے ہاتھوں سے چلم بھر کے وہ اُسے سلگا کر گرم کرتا تھا حقہ گرم ہونے کے بعد وہ نبر جو کی طرف بڑھاتا تھا۔ نبر جو نورا کی فرماں برداری کو دیکھ کر نہال ہو جاتا تھا۔ وہ اتنا زیرک ہونے کے باوجود نورا کے ارادے کو بھانپ ہی نہیں پایا۔ فردوسہ کے لئے رشتے پر رشتے آرہے تھے پر نبر جو اپنی پوتی کا رشتہ برادری سے باہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک دن نورا نے اپنے ایک رشتے دار کو نبر جو کے پاس تھاہ لینے بھیجا۔ نورا ایکدم ناٹھا نگوڑا تھا۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگھا۔ سبھی ماں باپ کی یہی خواہش رہتی ہے کہ اُنکی بیٹی جس گھر میں جائے اُس گھر میں اُسی کا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

راج ہو۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ ہو۔ نبر جو تو پہلے سے ہی مراد باندھے بیٹھا تھا نورا کا رشتہ کیا آ گیا وہ جیسے مراد پا گیا۔ اُسنے فوراً اس رشتے پر اقرار کی مہر ثبت کی۔ کئی رشتہ داروں نے نورا کے چال چلن کو لے کر اپنے اپنے خدشات ظاہر کئے مگر نبر جو پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ تو پہلے سے ہی یہ تہیہ کر کے بیٹھا تھا۔ مادھو جو کے انتباہ اور رشتہ داروں کے احتجاج کے باوجود اُسنے نورا کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ شادی بیاہ کے معاملے میں نورا قسمت کا دھنی ثابت ہوا۔ وہ فردوسہ کا پاسنگ برابر نہیں تھا پھر بھی فردوسہ کے نکاح نورا سے ہو گئے۔ نکاح کے چند مہینے بعد نبر جو اللہ کو پیارا ہو گیا۔ جب تک نبر جو زندہ تھا نورا قاعدے سے رہا۔ نبر جو نے آنکھیں کیا موندلیں نورا اپنی اصالت پر آ گیا۔ دن بھر گھاٹ پر اُس کی کسی نہ کسی سے لے دے چلتی ہی رہتی تھی رات ہوئی نہیں وہ لبہ کول کے بار پر پہونچ جایا کرتا تھا۔ جب وہ گھر لوٹتا تھا تو نشے میں دھت ہوتا تھا۔ آتے ہی وہ گھر میں ہنگامہ کھڑا کر لیتا تھا۔ کبھی سالن کو لے کے بیوی کی تھکا فضیحتی کی تو کبھی ٹھنڈے چاول کو بہانہ بنا کر اُسے لتے لے لیا۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا جب وہ اپنی بیوی کو چار باتیں سنا نہ ڈالتا تھا۔ فردوسہ کو مادھو جو کی کہی باتیں یاد آتی تھیں اور وہ اپنے نصیب کو رونے لگتی تھی۔ شاید مقدر کا لکھا بدلتا نہیں۔ بدلتا ہوتا تو اُس کا دادا اُسے اجگر کے منہ میں کیوں جھونک دیتا۔ وہ بھی سبھی رشتہ داروں کے منع کرنے کے باوجود۔

دیکھتے ہی دیکھتے فردوسہ کی گود ہری بھری ہو گئی۔ وہ چار بچوں کی ماں بن گئی۔ باپ بننے کے باوجود نورا کے رویے میں کوئی بدلاو نہ آیا۔ وہ پہلے سے زیادہ چڑ چڑا اور سفاک بن گیا۔ شروع شروع میں پاس پڑوسی ان کے جھگڑے ٹنٹے کے بیچ میں کود جایا کرتے تھے۔ ایک دن جب نورا نے اُن کو بھی آڑھی ترچھی سنا ڈالی تو اُنہوں نے میاں بیوی کے ٹنٹے سے دور رہنا ہی بہتر سمجھا۔ وہ روز روز کے اس حیص بیص سے کافی دکھی اور پریشان تھے پر نورا جیسے غنڈے موالی کے منہ کون لگتا اسلئے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی پتا مار کر بیٹھ جاتے تھے۔ آئے دن کے یہ رگڑے جھگڑے تو اب روز کا قصہ بن چکا تھا۔ فردوسہ تو اب ان ساری باتوں کی عادی ہو چکی تھی۔ وہ رودھو کے جتنے پیسے اُسے دے جاتا تھا اُس میں نون تیل کا خرچہ بھی پورا ہونا مشکل تھا پھر بھی فردوسہ زبان پر ایک شکایت کا لفظ تک نہ لاتی تھی۔ وہ باپ ہو کے بھی اپنی ذمہ داریوں کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اُس نے بچوں کی پرورش کا ذمہ بیوی کے سر پر ڈال دیا تھا۔ ایسے میں فردوسہ کی کمائی کیمیا کا کام کر جاتی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

تھی۔ وہ پمپوش کے ان مقدس پھولوں کو بیچ کر نہ صرف گھر چلاتی تھی بلکہ چار پیسے پس انداز کر کے بھی رکھتی تھی جو آڑے وقت میں کام آتے تھے۔

زندگی جیسی بھی تھی یکسوئی اور اطمینان سے گزر رہی تھی۔ فردوسہ کے چاروں بچے باقاعدگی کے ساتھ اسکول جایا کرتے تھے۔ وہ اپنے بچوں کو ایک اچھی زندگی دینے کی خواہاں تھی۔ وہ اُنہیں باپ کے نقش وقدم پر چلتے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ باپ کی دیکھا دیکھی میں بچوں کا ابتدا ہی بگڑ جائے اور وہ گمراہ ہو کر ابھی سے اپنی عاقبت بگاڑ کے بیٹھ جائیں اسلئے وہ اُنہیں اپنے باپ کے سایے سے بھی دور رکھتی تھی۔ اُس کا تو بس ایک ہی ارمان تھا کہ اُس کے بچے پڑھ لکھ کر اچھے شہری بنیں۔ چاروں بچے پڑھنے لکھنے میں بڑے تیز تھے۔ وہ ماں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اُسی کی بات مانتے کیونکہ اُن کا لگاؤ ماں کی طرف زیادہ تھا۔ باپ کو تو وہ ٹھینگا دکھاتے تھے۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ اُنہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی اُنکے منہ اُتر جاتے تھے۔ سب سے زیادہ تو اُنہیں اُس کی مئے خوری سے چڑ تھی۔ وہ جب نشے میں غین ہو کر کبھی فردوسہ پر ہاتھ اُٹھا لیتا تھا تو وہ ماں کی حمایت میں مٹھیاں تان کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ نور محمد باہر سے جتنا مظبوط دکھائی دیتا تھا اندر سے وہ اتنا ہی کمزور تھا۔ بچوں کے جارحانہ تیور دیکھ کر ہی وہ دبک کے بیٹھ جاتا تھا اور پھر کسی خالی کونے کھدرے میں بیٹھ کر بُدبُدر کرتا رہتا تھا۔

اچانک ایک دن سب کچھ بدل گیا۔ وادی میں بڑے پیمانے پر شورش کی ابتدا ہوئی۔ بغاوت کی لہر کیا اُٹھی سب کچھ بکھر کے رہ گیا۔ آئے دن ہڑتالیں اور کرفیو روز کا معمول بن گیا۔ کبھی کراس فائرنگ میں عام شہری مارے جاتے تھے اور کبھی بم دھماکوں میں قیمتی انسانی جانیں تلف ہوتی تھیں۔ کئی ٹورسٹ اس تشدد میں جان بحق ہو گئے۔ اُس کے بعد ٹورسٹوں نے وادی کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ آخر ہو کیا رہا ہے۔ جو ہاؤس بوٹ سیاحوں سے بھرے رہتے تھے وہ ایکدم ویران ہو گئے۔ کاروبار ٹھپ ہو کے رہ گیا۔ لوگ گھروں میں مقید ہو کر رہ گئے۔ اس ساری ہنگامہ آرائی میں ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ نور اب گھر میں ہی پڑا رہتا تھا۔ اب وہ طلب ہونے کے باوجود شراب نہیں پیتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ چند دین داروں نے اُسے ایک دن نشے کی حالت میں پکڑا اور پھر اُسے بے بھاؤ کی دے ڈالی۔ چار چوٹ کی مار کھانے کے بعد وہ ادھ موا ہو کر رہ گیا۔ جاتے جاتے اُنہوں نے اُس کی کنپٹی پر ریوالور تان کر اُسے متنبہ کیا کہ آئندہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اگر اسے نشہ کرتے ہوئے پکڑا گیا تو اُس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ نورا پر اس واقعے کے بعد ایسی ہیبت طاری ہوگئی کہ وہ دن میں بھی گھر سے باہر نہیں نکلتا تھا۔ کبھی اُسے ایک سگریٹ کا پیکٹ منگانا ہوتا تو وہ اپنے بچوں کے پاؤں پکڑ کر اُنہیں بازار بھیج دیتا تھا۔ اُس کے بیکار ہونیکے سبب اب گھر کا سارا بوجھ فردوسہ کے سر پر آپڑا تھا۔ وہ اکیلی جان حالات سے کیسے لڑ پاتی۔ وادی کے حالات تو ایسے ہو گئے تھے کہ گھر سے باہر نکلنے کا جھوکھم بھی کوئی لینے کے لئے تیار نہ تھا ایسے میں وہ پھول لے کے کہاں بیچ کے آتی۔

جب گھر کے حالات کافی ابتر ہونے لگے تو ایک دن وہ سر پر کفن باندھ کر اپنی ناو لے کر سویرے سویرے نکل گئی اور کچھ پھول توڑ کر گھاٹ پر پہونچ گئی۔ وہ جب گھاٹ پر پہونچ گئی تو اُسے ایک بھی پنڈت دکھائی نہیں دیا جو کہ اُس کے مستقل خریدار تھے۔ گھاٹ تو مرگھٹ کی طرح ویران پڑا تھا۔ گھاٹ کی یہ ویرانی دیکھ کر اُس کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ وہ اُداس اور مغموم ہو کر واپس گھر کی طرف لوٹ گئی۔ راستے میں ناو کھیتے کھیتے اُس کی آنکھوں سے آنسوں کی جھڑی لگ گئی۔ وہ ایسے رونے لگی جیسے اُس کا کوئی عزیز مر گیا ہو۔ بہت دیر تک وہ پانی کی خاموش لہروں کو اپنے دکھ کا فسانہ سناتی رہی۔ وہ روز پھول لے کے گھاٹ پر پہونچ جایا کرتی تھی پر اُسے یہ پھول خریدنے والا کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پتہ چلا کہ جوان پھولوں کے خریدار تھے وہ اس وادی سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ ہفتوں مہینوں اُن کا انتظار کرتی رہی پر اُن میں سے کوئی لوٹ کر نہیں آیا۔ اُس کے پھول پڑے پڑے سڑتے رہے پر وہ ان پھولوں کو کسی اور کے ہاتھ بیچنے پر تیار نہ ہوئی۔ گھر کی حالت دیکھ کر وہ بڑی آزردہ اور پریشان ہوئے جا رہی تھی۔ نورا بھی اب آٹھوں پہر گھر میں ہی پڑا رہتا تھا۔ اُس کا دھندہ تو بالکل ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا۔ ڈل کے باسی ٹورسٹ کی صورت دیکھنے کے لئے ترس گئے تھے۔

نورا ایکطرف اپنی طلب سے پریشان تھا اور دوسری طرف مسلسل بیمار رہنے کے سبب وہ زندگی سے بیزار ہو کے بیٹھا تھا۔ ایک صبح جب فردوسہ نیند سے اُٹھی تو یہ دیکھ کر وہ دھک سے رہ گئی کہ نورا اپنے بستر پر نہیں تھا۔ وہ اُٹھ کر دوسرے کمرے میں گئی، وہ وہاں بھی نہیں ملا۔ وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے کو کھنگالتی گئی پر وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ اُسنے بچوں کو جگایا اور اُنہیں باپ کی کھوج میں لگایا۔ دوپہر ہوئی وہ کہیں نہ ملا۔ اُنہوں نے ناپو کا چپہ چپہ چھان مارا۔ اُنہیں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اُس کی گرد تک نہ ملی۔ فردوسہ چھاتی پیٹ پیٹ کر رونے لگی۔ اُسے لگا کہ نورا نے تنگ آ کر جان دے دی ہے۔ شام کو جب یہ خبر ملی کہ نورا جموں بھاگ گیا ہے تو فردوسہ کی جان میں جان آ گئی اور یہ سوچ کر اُسنے سجدہ شکر منالیا کہ نورا مرا نہیں زندہ ہے۔

فردوسہ کے گھر کی حالت دن بہ دن خستہ ہوئی جا رہی تھی۔ اُسنے سوچا کہ اس طرح بھوکے پیاسے مرنے سے اچھا ہے کہ وہ کمل ککڑی نکال کر بیچے۔ کمل ککڑی جو کہ کمل کے پھول کی ڈنڈی ہوتی ہے اور جس کو کشمیری زبان میں ندرو کہتے ہیں، سبزی کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ اس کی ہمیشہ کشمیر میں مانگ بنی رہتی ہے۔ یہی فیصلہ کر کے جب وہ صبح سویرے ناو میں بیٹھ کر ڈل کے بیچوں بیچ پہونچ گئی تو یہ دیکھ کر وہ دھک سے رہ گئی کہ سارے پمپوش مرجھا گئے تھے۔ اُس نے اس سے قبل کبھی بھی ان پھولوں کو اس طرح مرجھائے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ پورے دن اُداس اور افسردہ رہی۔ رات کو اُس نے ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا۔ اُس کا جی کر رہا تھا کہ وہ دہاڑیں مار مار کر روئے۔ وہ یہ سوچ کر مری جا رہی تھی کہ آخر پمپوش مرجھانے کیوں لگے ہیں۔ کیا موجودہ حالات سے ان پھولوں کا کوئی تعلق ہے؟

رات کو اُس نے ایک ڈراونا خواب دیکھا۔ خواب میں اُس نے مادھو جو کو دیکھا جو خون میں لت پت تھا اور جو ہر آنے جانے والے سے بس ایک ہی سوال کر رہا تھا۔ ''مجھے پمپوش کب لا کر دو گے۔ یہ دیکھو میرا شیو ناتھ پمپوش دیکھنے کے لئے کس طرح ترس رہا ہے۔''

وہ ہڑبڑا کر اُٹھی اور بین کر کے رونے لگی۔ اُس نے پچھلے کئی سالوں سے مادھو جو کی کوئی خیر خبر لی ہی نہیں تھی۔ اُس کا کلیجہ پھٹا جانے لگا۔ وہ اُس سے ملنے کے لئے تڑپ اُٹھی۔ اُس نے دیوار پر لگے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ صبح کے چھ بج چکے تھے۔ وہ سرعت سے اُٹھی۔ غسل خانے میں جا کر پہلے نہائی دھوئی پھر نیا پھرن پہن کر وہ ناؤ کی طرف بڑھی اور ناؤ میں بیٹھ کر وہ اُسے تیزی سے اُس اور کھینے لگی جہاں پر پمپوش کھلے ہوتے تھے۔ یہ دیکھ کر وہ پھول کی طرح کھل اُٹھی کہ آج بہت سارے پمپوش اُس کے چشم براہ تھے۔ اُس نے جلدی سے چند پھول توڑے اور پھر اپنی ناؤ میں بیٹھ کر وہ اسے ڈل گیٹ گھاٹ کی طرف کھینے لگی۔

گھاٹ پر پہونچ کر اُس نے اپنی ناؤ کو ایک کھونٹے سے باندھا اور وہ سڑک پر آ کے کھڑی ہو گئی۔ اُس نے لال چوک جانے والی بس پکڑ لی۔ بس کچھوے کی چال سے چلتی جا رہی تھی۔ فردوسہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اندر ہی اندر اُبل رہی تھی۔ اُس کے اندر صبر کا یارا نہ تھا۔ جونہی بس زرا سی دھیمی ہوئی تو وہ بس سے اُتر گئی اور پیدل ہی گنپت یار کی اور لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگی۔ اُس کے دل میں جذبات کا ایک تلاطم اُٹھ رہا تھا۔ ایک ایسا طوفان جو ضبط کے سبھی باندھ توڑ کے نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ آج اُس شخص سے ملنے جا رہی تھی جسمیں اُسے اپنے دادا کی شبیہہ نظر آتی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ کس طرح مادھو جو کا سامنا کر پائے گی۔ کیا وہ اُسے اس بات کے لئے ڈانٹے گا نہیں کہ اُس نے آڑے وقت میں اُس کی ایک بار بھی سدھ نہ لی۔ وہ ان ہی سوالوں میں اُلجھی ہوئی جب گنپت یار مندر کے اندر ہو پہنچ گئی تو یہ دیکھ کر اُس کا دل بلیوں اُچھل پڑا کہ مندر میں شیو کی مورتی کی جگہ خود مادھو جو براجمان تھا۔ وہ اپنے خوشی کے آنسو روک نہ سکی اور بے قابو ہو کر اُس نے اپنی تھیلی میں رکھے سارے پیمپوش نکال کر اُس کی طرف اُچھال دئے اور پھر وہ ریلینگ کے ساتھ لگ کر پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔ رونے کی آواز سن کر باہر پہرہ دے رہے سی۔ آر۔ پی کے کچھ جوان بندوقیں تانے اندر آ گئے۔ ایک عورت کو مندر کے اندر دیکھ کر وہ سناٹے میں رہ گئے۔ اُنہوں نے ہڑبڑاہٹ میں اُسے پکڑ لیا اور اُسے گھسیٹتے ہوئے باہر لے جانے لگے۔ وہ مسلسل روتی چلاتی رہی شور سن کر مندر کا نیا پجاری اپنے کمرے سے باہر آ گیا۔ اُس نے جب ایک مسلم خاتون کی یہ درد شا دیکھی تو اُس نے اُسے جوانوں سے چھڑا لیا اور اُسے ایک کونے میں بٹھا کر پوچھا۔ ''تم اس مندر میں کیسے آ گئی ہو بہن؟''

''وہ جو مادھو جو اندر بیٹھا ہے نا میں اُسی سے ملنے آئی ہوں!''

''مادھو جو اندر بیٹھا ہے؟'' اُس نے چونک کر پہلے اُس کی طرف دیکھا اور پھر اُس کے سراپا کا ایک طائرانہ جائزہ لے کر بڑی رقت بھری آواز میں بولا۔

''تمہیں بھرم ہوا ہے بہن۔ مادھو جو یہاں کہاں ہو سکتا ہے۔ اُسے تو مرے ہوئے ایک سال ہو گیا۔ پچھلے سال جموں میں سانپ کے کاٹنے سے اُس کی موت ہو گئی۔''

''نہیں!'' وہ تڑپ کر کھڑی ہو گئی اور پھر سختی سے بولی ''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ مادھو جو کبھی مر نہیں سکتا۔ وہ اندر بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے خود اُسے اپنی ان آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ اس طرح مجھ سے پیمپوش لئے بنا کیسے جا سکتا ہے۔ وہ اگر چلا گیا تو پھر اس وادی میں پیمپوش کبھی نہیں کھل پائیں گے۔ کبھی نہیں'' کہہ کر وہ پنڈت کے کاندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روتی ہی۔

■ ■ ■

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri